Rehan
http://www.rehanahmeds.com
Ahmed

اللہ کے بارگاہ میں پیش کی جانے والی ایک سچی قربانی کی داستان

حج اکبر

Rehan
http://www.rehanahmeds.com
Ahmed

علیم الحق حقی

مکتبہ القریش ○ سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور

Rehan
Ahmed

گھر کی چوکھٹ پار کرنے سے پہلے چندو نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر وہ گلی میں نکل آیا۔ گلی میں کوئی بچہ بھی نہیں تھا ورنہ اس وقت وہاں سناٹے کا کوئی کام نہیں تھا۔ بچے دھما چوکڑی منا رہے ہوتے تھے۔ شاید اس کا سبب بارش تھی۔ بچے کھیلنے، نہانے اور بیر بہوٹیاں پکڑنے کے لئے شاید میدان کی طرف نکل گئے تھے۔

چندو کو مایوسی ہوئی۔ خاموشی اور بے رونقی اسے کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ مستانہ انداز میں ٹہلتا ہوا گلی کے نکڑ کی طرف بڑھا۔ بارش کی وجہ سے جگہ جگہ پانی بھر گیا تھا، چھوٹے چھوٹے تالاب سے بن گئے تھے۔ وہ پانی سے بچ کر چل رہا تھا مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ زمین تو بہرحال گیلی ہو رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوری طور پر اسے ایک چھینک آئی اور پھر دوسری....

اسی وقت عبدالصمد کی بیوی زیب النسا اپنے دروازے پر آئی۔ چندو اس وقت اس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ زیب النسا نے اسے پکارا "اے چندو، کہاں جا رہا ہے؟"

چندو نے آواز سنی مگر صرف کن آنکھیوں سے زیب النسا کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔ وہ اس وقت رک کر اپنا راستہ کھوٹا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"نخرے تو دیکھو اس کے۔ دیکھتا بھی نہیں ہماری طرف۔ مطلبی ہے مطلبی۔" زیب النسا نے جل کر کہا "اپنا مطلب ہو تو کیسے آکر خوشامدیں کرتا ہے ہماری۔ آنے دے باجی کو۔ آج انہیں بتاؤں گی کہ تو کیا کیا کرتا پھرتا ہے۔"

چندو کی چال کی بے نیازی اور نمایاں ہو گئی۔ پلٹ کر دیکھنے کا بھی سوال نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔

گلی سے نکلتے ہی اس کی چال تبدیل ہوگئی۔ تنگ گلی اور چوڑی سڑک میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ وہاں چلتے ہوئے اپنے چھوٹے ہونے کا احساس ہوتا ہے اور سڑک پر اپنا آپ بہت بڑا اور بہت پھیلا ہوا لگنے لگتا ہے۔

چندو نے گہری سانس لے کر سینہ پھلا لیا۔ گلی سے چوڑی یہ سڑک اسے اس لئے بھی اچھی لگتی تھی کہ وہ کچی تھی۔ پکی سڑک پر چلنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔

سڑک پر گلی کے مقابلے میں رونق تھی۔ اگرچہ روز کے مقابلے میں کم تھی۔ اس کچی سڑک پر دو رویہ دکانیں تھیں۔ یہ سڑک آگے جا کر مین روڈ سے ملتی تھی۔ وہیں بس اسٹاپ بھی تھا۔

چندو کی چال میں بانکپن آگیا۔ اب وہ اس انداز سے چل رہا تھا' جیسے کوئی پولیس والا اپنے علاقے میں پیٹرولنگ کر رہا ہو۔ چلتے چلتے اسے پھر ایک چھینک آئی۔ اس کے بعد دوسری چھینک بھی آئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اسے ایک چھینک کبھی نہیں آتی تھی۔ چھینکیں دو دو کر کے آتی تھیں۔

اسے اپنے نتھنوں کے نیچے نمی کا احساس ہونے لگا۔

"ارے چندو' چھینکیں آ رہی ہیں تجھے۔" ایک دکان دار نے پکارا "نزلہ زکام ہو جائے گا پگلے۔ برسات کے موسم میں ایسے نہیں پھرتے۔ احتیاط کیا کر۔"

چندو نے سر گھما کر بڑے باوقار انداز میں دکان دار کو دیکھا۔ اسی لمحے پھر دو چھینکیں آئیں۔ اس کا باوقار انداز ملیامیٹ ہو گیا۔ چھینکیں ہوتی ہی ایسی چیز ہیں۔ لجلجا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ چندو نے دکان دار کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی مشکل سے سر ہلا کر گویا اس کی بات کی رسید عطا کی اور آگے چل دیا۔

"چندو کو زکام ہونے والا ہے۔" دکان دار نے بڑی فکر مندی سے اپنے پڑوسی کو مطلع کیا۔

"برسات میں اس طرح نکلنا ہی نہیں چاہیے۔" دوسرے دکان دار نے تبصرہ کیا "یہ زکام بہت پریشان کرتا ہے۔"

"اور کیا مگر چندو کو کون سمجھائے۔ بے پروا ہے بے پروا۔ بیمار ہوگا تو پتا چلے گا۔"

"ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے یار۔ تجھے تو پتا ہے' وہ باجی کی جان ہے۔۔۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔"

چندو کو ان تبصروں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ دین محمد کی دکان کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔

○

اس علاقے میں دین محمد کی دکان سب سے زیادہ چلتی تھی۔ مشہور تھا کہ کسی چیز کی بھی ضرورت ہو' وہ دین محمد کی دکان پر ضرور ملے گی۔ دین محمد بیٹے کی نعمت سے محروم تھا اور اب دکان اس سے اکیلے سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد اسے اپنے مطلب کا ایک ایمان دار لڑکا مل گیا۔ یہ تین دن پہلے ہی کی بات تھی۔ لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت تندرست اور توانا تھا۔ بڑی بڑی بوریاں اٹھا کر ادھر سے ادھر رکھ دینا اس کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ دین محمد نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے اسے رکھ لیا۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے دین محمد کو خیال آیا کہ بادام اور پستے جس طرف رکھے ہیں' وہاں تو ٹپکا لگتا ہے۔ اس نے جا کر دیکھا۔ چیزیں ٹپکے سے محفوظ رہی تھیں مگر سیلن کا اثر بہرحال ہوا تھا۔

دین محمد نے باہر دیکھا۔ دھوپ نکل آئی تھی "دیکھ بیٹا کامل' یہ ڈرائی فروٹ کی بوریاں باہر دھوپ میں رکھ دے۔" اس نے لڑکے سے کہا "اور پھر یہ جو پیچھے ٹپکے کا پانی جمع ہے' اسے سوت کر ذرا پوچھا لگا دے۔ میں اتنے میں گھر سے کھانا لے کر آتا ہوں۔ فرش بالکل خشک کر دینا۔"

"اچھا بھائی جی!" کامل نے کہا۔

دین محمد چلا گیا۔ کامل نے پچھلے حصے میں جا کر ڈرائی فروٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں بادام پستے اور اخروٹ کی گری ایسی چیزیں تھیں' جو سیلن سے متاثر ہوئی تھیں۔ اس نے حسب توفیق پہلے چکھنے کی رسم ادا کی پھر ایک ایک کر کے بوریاں باہر لایا۔ انہیں دھوپ میں رکھنے کے بعد اس نے تینوں چیزیں تھوڑی تھوڑی سی جیب میں رکھیں اور

پانی سوتنے' پوچا لگانے اور فرش خشک کرنے کے لئے اندر چلا گیا۔ اسے چندو کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا!

○

چندو پہلے تو ٹھٹکا۔ پھر اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ آنے والی دو چھینکیں اس کے سسٹم سے خود بہ خود حذف ہو گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر تینوں بوریوں کا معائنہ کیا۔ بادام' پستے اور سب سے بڑھ کر اخروٹ کی گری۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

چندو ندیدا نہیں تھا اور یہ بھی نہیں کہ ڈرائی فروٹ اس کے لئے خواب جیسی کوئی چیز ہو۔ باجی یہ سب چیزیں اسے روز ہی کھلاتی تھیں مگر ہر چیز حساب کتاب سے ملتی تھی۔ جب کہ چندو کا جی چاہتا کہ ایک بار تو ان چیزوں سے لبالب بھر جائے۔

چندو بے حد لاڈلا تھا۔ باجی اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مگر وہ اسکول ٹیچر بھی تھیں۔ کلاس میں بھی وہ بہت اچھا لیکچر دیتی تھیں۔ جس وقت وہ چندو کو سمجھاتیں' ایسا ہی لگتا کہ کلاس کو کچھ ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایسے میں پڑوسی ایک دوسرے سے کہتے۔ باجی چندو کی کلاس لے رہی ہیں۔

باجی گن کر چندو کو سات بادام' سات پستے اور تین اخروٹوں کی گری دیتیں۔ اس کے نتیجے میں چندو کی طلب بھڑک اٹھتی تو وہ اسے سمجھاتیں "دیکھو چندو' میرے بیٹے' اعتدال بڑی چیز ہے۔ اعتدال ہر نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ اعتدال میں ہی عافیت ہے۔"

چندو اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں التجا سجائے انہیں تکتا رہتا۔ "بیٹے' آدمی اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو بڑی سے بڑی نعمت کو بھی اپنے لیے زحمت بنا لیتا ہے۔" باجی کا لیکچر جاری رہتا "اب اخروٹ کی گری ہی کو لے۔ زیادہ کھائے گا تو پاخانے میں خون آنے لگے گا۔ ڈاکٹروں کے چکر لگیں گے۔ کڑوی دوائی ملے گی اور طبیعت ٹھیک ہونے تک کھانے کی چھٹی۔ بادام بھی گرمی کرتا ہے۔ حکما نے سات بادام کا فائدہ بتایا ہے اور اس کے بعد ہر بادام فائدہ کم کرتا اور نقصان بڑھاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر باجی چندو کی آنکھوں میں جھانکتیں مگر وہاں التجا کے اور گہرے رنگ نظر

آتے۔ یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آتا" پھر یہ بھی تو دیکھ کر تیرے ماں باپ بہت امیر تو نہیں ہیں نا۔ اللہ کا شکر ہے۔ اچھا کھاتے پیتے پہنتے ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ اتنا تو نہیں ہے کہ میں تیرے لیے ڈرائی فروٹ کی بوریاں لاسکوں۔" اچانک ان کا لہجہ تیز ہوجاتا "اور اتنا ہو تو بھی میں اتنا کھلا کر تجھ پر ظلم تو نہیں کرسکتی۔ ماں ہوں تیری" پھر اس کی آنکھوں کو دیکھ کر وہ موضوع ہی بدل دیتیں "اچھا' اب میں تیرے لیے بالائی لاتی ہوں۔"

سو ڈرائی فروٹ کی بوریاں دیکھ کر چندو کو ایسا لگا کہ اس کا خواب سچا ہوگیا ہے۔ سب سے پہلے وہ اخروٹ کی گری پر پل پڑا۔ مگر یہ نہیں تھا کہ بادام اور پستوں کے معاملے میں اس کے کفران نعمت کیا ہو۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش ہی نہیں رہا۔

اچانک کسی نے اس کی گردن پکڑلی۔ گرفت بہت سخت تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گردن پکڑنے والا کوئی جان دار آدمی ہے۔ چندو کے لئے یہ بات نئی تھی۔ آج تک کسی کو اس طرح کی جرات نہیں ہوئی تھی۔

چندو نے جھرجھری سی لی' پھر زور لگایا۔ اس کی گردن آزاد ہوگئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کامل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے بڑا بھی تھا اور جان دار بھی۔ چندو بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

ابے ..... باپ کا مال سمجھ کر کھائے جا رہا ہے۔" کامل غرایا۔ "ایک ایک پیسہ نکلواؤں گا تیرے باپ سے۔" اس نے پھر چندو کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

چندو بہت غیر محسوس طور پر تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ گردن ہاتھ میں نہ آنے کی وجہ سے کامل کا توازن تھوڑا سا بگڑا۔ اسی لمحے چندو نے ایک مکا اس کے سینے پر رسید کردی۔ کامل کم از کم چار فٹ پیچھے جا گرا۔ اب وہ چت پڑا آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔

کامل کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس مکے میں اتنی قوت تھی کہ اسے لگا' دو ایک پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے آسمان پر اسے ستارے ناچتے نظر آرہے تھے۔ مقام شکر تھا کہ اس وقت کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ کان دار بھی مصروف تھے۔ کسی نے اس کا یہ توہین آمیز تماشا نہیں دیکھا تھا۔

چندو مداخلت کار سے نمٹ کر پھر ڈرائی فروٹ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس کا

انسداد دیدنی تھا۔

کامل کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ جب تک وہ بے بس پڑا آسمان کو تک رہا تھا' تب تک تو خیریت تھی مگر ذرا سا سنبھلتے ہی اس کا وجود غصے اور اشتعال سے بھرنے لگا۔ وہ اٹھا اور اس نے سر جھٹک کر دماغ پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کیا۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا کہ چندو پھر اسی مشغلے میں منہمک ہوگیا ہے۔

وہ دبے پاؤں چندو کی طرف بڑھا۔ اس نے مضبوطی سے چندو کے دونوں کان تھام لیے اور غرا کر کہا "اب دیکھتا ہوں بیٹا تجھے۔ دماغ ٹھیک کردوں گا۔"

○

باجی بس سے اتریں اور اس سڑک کی طرف چل دیں' جو ان کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے چل رہی تھیں۔ ان کے قدم دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے۔ اسکول کے بچے انہیں تھکا دیتے تھے۔

مگر پھر جو انہوں نے نظریں اٹھا کر سامنے کی سمت دیکھا تو پہلے ان کے قدم تیز ہوئے پھر وہ باقاعدہ دوڑنے لگیں۔ برقع پہنے ہوئے دوڑنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو دوڑنا ہی ناقابل تصور تھا۔ مگر جو منظر انہوں نے دیکھا تھا' اس کے بعد انہیں کسی بات کا خیال نہیں رہا تھا۔

وہ ہانپنے لگیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھیں۔ ارے بدبخت' یہ کیا کر رہا ہے۔ میرے نازوں کے پلے بیٹے پر ہاتھ اٹھاتا ہے مگر ہانپنے کی وجہ سے ان کے لیے منہ سے ایک لفظ نکالنا بھی ناممکن تھا۔ البتہ یہی الفاظ ان کے اندر چلا رہے تھے۔ جسم کی دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔

وہ آندھی طوفان کی طرح کامل کے سر پر پہنچیں۔ جو مضبوطی سے چندو کے دونوں کان تھامے اس سے اہانت آمیز گفتگو کر رہا تھا۔ کبھی وہ اس کے پھول سے رخساروں پر تھپڑ بھی رسید کر دیتا۔ اسے پتا ہی نہ تھا کہ کوئی سائیکلون اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

باجی نے اپنا بیگ اندھا دھند گھما کر مارا جو کامل کے سر پر لگا۔ اسی افتاد سے

بوکھلا کر اس نے چندو کے کان چھوڑ دیے۔ اتنی دیر میں اس کے جسم کے مختلف حصوں پر تین چار بار بیگ کا ہنٹر پڑ چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر اور چہرے کو پناہ دیتے ہوئے "طوفان کے مرکز" کو دیکھا۔ برقع پوش کو دیکھ کر وہ اور بوکھلا گیا۔

"آ.... آپ ..... کیوں مار رہی ہیں ..... م ..... مجھے؟"

"میں تو تیرا خون پی جاؤں گی الو کے پٹھے۔" باجی دہاڑیں۔

"ب ..... بات کیا ہے؟"

"میرے بیٹے کو مار رہا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بات کیا ہے۔"

"..... یہ ہمارا ڈرائی فروٹ کھا رہا تھا۔" کامل نے فریاد کی۔

"تو ہے کون؟"

"میں اس دکان پر ملازم ہوں۔"

"جو جرات اس دکان کا مالک نہیں کر سکتا' وہ تو نے ملازم ہو کر کی ہے۔" باجی نے پھر بیگ کا کوڑا چلایا۔

اس دوران چندو کبھی باجی کو دیکھتا اور کبھی کامل کو۔ اس کی نظروں میں اور اس کے انداز میں بڑی معصومیت تھی۔

"دکان میری ذمے داری ہے اماں۔" کامل نے کہا۔

"اماں ہوگی تیری ماں۔" باجی کا غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ باجی تھیں سب کی۔ انہیں اماں کہنے کی ہمت کبھی کسی بچے نے بھی نہیں کی تھی" اور یہ دکان تیری ذمے داری ہے ..... ایں ۔ دین محمد کہاں ہے۔"

"وہ جی کھانا لینے گھر گئے ہیں۔"

"خیر..... تجھے تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" باجی پھر شروع ہو گئیں۔

○

دین محمد ٹفن کیریر لے کر گلی سے نکلا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسا منظر دیکھنے کو ملے گا۔ دکان کے سامنے باجی بیگ کو کوڑے کی طرح گھما گھما کر کامل کو مار رہی تھیں اور کامل بندروں کی طرح اچھل کود کر کے خود کو بچانے کی

کوشش کر رہا تھا۔ سب سے بڑا ستم یہ کہ چندو ڈرائی فروٹ کی تین بوریوں کو باری باری اور بے حد خشوع و خضوع سے نواز رہا تھا۔

یہ ہوش ربا منظر دیکھتے ہی دین محمد کے تو اسپرنگ لگ گئے۔ وہ اتنا تیز دوڑا کہ زندگی میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ پھرتی سے باجی اور کامل کے درمیان آگیا۔ اس کے نتیجے میں باجی کے بیگ نے اس کی بھی تواضع کر ڈالی۔ ہانپ رہا تھا۔ ابتدا میں اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

باجی کو تو کئی سیکنڈ بعد یہ احساس ہوا کہ ان کے سامنے دین محمد آگیا ہے۔ انہوں نے ہاتھ روکا۔

"کیا ہوا باجی؟ بات کیا ہے؟" دین محمد نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟" باجی نے جواب دینے کے بجائے جواب طلبی کی۔

اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھا ہے باجی!"

"ہاتھ بٹانے کے لئے یا شرفا کے بچوں پر ہاتھ چھوڑنے کے لیے؟"

"کیا مطلب؟ آپ بات تو بتائیں باجی۔"

"یہ میرے چندو کو مار رہا تھا۔ اس کے دونوں کان ایسے پکڑے تھے قصائی نے کہ....." باجی کا گلا رندھ گیا۔

دین محمد نے ایک نظر چندو کو دیکھا' جو اس وقت اخروٹ کی گری سے کام و دہن کی تواضع کر رہا تھا۔ پھر وہ کامل کی طرف مڑا' جو حواس باختہ کھڑا تھا "کیوں بھئی کامل' یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تو چندو کو مار رہا تھا۔"

"بھائی جی' یہ ڈرائی فروٹ ایسے کھا رہا تھا' جیسے سونف کی پھنکی لگا رہا ہو۔ میں نے روکا تو اس نے مجھے ٹکر مار کر گرا دیا۔" کامل نے فریاد کی۔

باجی نے پھر بیگ گھمایا "تجھے تو میں ٹھیک کر کے رہوں گی۔"

"باجی' معاف کردیں۔ نیا ہے نا۔" دین محمد نے سفارش کی۔ "نہ آپ کو جانتا ہے' نہ چندو سے واقف ہے۔ معاف کردیں.....!"

"اسے معاف کردوں۔ یہ چندو کے ساتھ بدسلوکی کر رہا تھا جب کہ چندو کو کبھی میں نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا۔ میں تو اسے معاف نہیں کروں گی۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں اسے نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔" دین محمد نے خشمگیں لہجے میں کہا پھر وہ کامل کی طرف مڑا اور بائیں آنکھ دباتے ہوئے بولا "جا اب بھوکا مر۔ مجھے کیا۔ میں تو تین دن کے پیسے دے کر تجھے رخصت کردوں گا۔ اب تو جان اور تیرے بھائی بہن جانیں۔"

کامل نے جو اشارہ پایا تو پوری اداکاری شروع کردی "بھائی جی' یہ ظلم نہ کرو۔ ہمارے تو گھر میں فاقے ہو جائیں گے۔".

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔" دین محمد نے سرد لہجے میں کہا "تو نے باجی کو خفا کیا' چندو کو مارا۔ مجھے اب تجھ پر رحم نہیں آسکتا۔" حالاں کہ وہ اتنا جان دار ملازم نہیں کھونا چاہتا تھا۔

اتنی دیر میں باجی کے چہرے کے عضلات نرم ہوچکے تھے۔ وہ کامل کی طرف مڑیں "تو بہت غریب ہے بیٹے؟" انہوں نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

کامل نے منہ لٹکایا اور اثبات میں سرہلا دیا "اب ہمارے گھر پھر فاقے شروع ہو جائیں گے۔" اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی "ہم سات بھائی بہن ہیں باجی۔" اس بار اس نے باجی کو اماں کہنے کی غلطی بھی نہیں کی۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" باجی نے کہا اور دین محمد کی طرف مڑیں۔ "اسے نہ نکالو۔ یہ تو ظلم ہوگا۔"

"ظلم تو اس نے کیا ہے۔ میں اسے نہیں رکھوں گا۔" "میری خاطر رکھ لو اسے۔"

خاصی رد و قدح کے بعد دین محمد راضی ہوگیا "جا.... تجھے باجی کی خاطر بخشا۔ چندو بابا کو پیار کر۔"

کامل نے فوراً" چندو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی پیشانی پر ایک بوسہ بھی رسید کردیا "سوری چندو بابا!"

اتنی دیر بعد پہلی بار باجی نے چندو کی طرف دیکھا "ارے چندو' اتنی بدتمیزی! کتنی بار تجھے سمجھایا کہ پوچھے بغیر کبھی کسی کی چیز نہیں کھاتے۔ تجھے تو میں گھر چل کر دیکھوں گی۔ چل اب سیدھا گھر چل۔ چل فورا۔"

چندو نے بڑی معصومیت سے باجی کو دیکھا' جیسے اس کی سمجھ میں ان کے غصے کا سبب نہیں آرہا ہو۔ پھر اس نے کامل' دین محمد اور ان تمام لوگوں کو دیکھا' جو اتنی دیر میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے باجی کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا کہ وہ اسے اتنے سارے لوگوں کے سامنے ڈانٹ رہی ہیں۔

"سنا نہیں تو نے۔ گھر چل۔"

اس بار چندو پلٹا اور سر جھکاتے ہوئے واپس چل دیا۔ اس کی چال سے شرم ساری کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے باجی بھی چل دیں۔

ان کے جانے کے بعد دین محمد نے شرمندگی سے جمع ہونے والوں کو دیکھا۔ وہ سب محلے ہی کے لوگ تھے۔

"یہ سب کیا تھا بھائی جی؟" کامل نے دین محمد سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت ہی نہیں' جانے اور کیا کیا تھا۔

"تو نہیں سمجھا۔ ان باجی کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی ان کے چندو کو ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے جب کہ تو نے تو اسے مارا تھا۔"

"مگر بھائی جی ...."

"اب تو دماغ نہ کھپا۔ جا اپنا کام کر۔" دین محمد نے اسے ڈپٹا۔ وہ دکان میں چلا گیا تو دین محمد نے تماشائیوں سے کہا "ویسے یہ زیادتی ہے باجی کی۔ چندو نے میرا بہت نقصان کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوریوں کا جائزہ لیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بادام' پستے اور اخروٹ کی گری میں کتنی کمی واقع ہوئی ہے۔

"کیوں بھئی' کیا نقصان ہوا ہے؟" ایک صاحب نے پوچھا۔ وہ باجی کی گلی میں ہی رہتے تھے۔

"اجی' یہ بادام' پستے اور اخروٹ کی گری' سب مہنگی چیزیں ہیں۔ کتنا کھا گیا کم بخت ...."

"دینو' زبان سنبھال کے ....." ایک صاحب نے اسے للکارا۔ "چندو ہمارے لئے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔"

"اسے تو اللہ نے بیٹے سے محروم رکھا ہے۔ یہ کیا جانے بیٹے کی محبت...." ایک

اور صاحب بولے۔

"یہ سب کہنا آسان ہے۔ آپ لوگوں کا کیا بگڑا ہے۔ نقصان تو میرا ہوا ہے۔"

دینو کا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا۔

"کتنا نقصان ہوا ہے' بتا دو۔ ہم پورا کردیں گے۔" ایک اور صاحب بولے "مگر اب چندو کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہنا۔"

دین محمد بہت اچھا دکان دار تھا۔ جانتا تھا کہ جھگڑالو پن دکان داری کو تباہ کر دیتا ہے۔ وہ تو کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا اور یہاں تو معاملہ چندو کا تھا' جس سے پورا علاقہ محبت کرتا تھا۔ دو تین سو روپے کی خاطر دکان چوپٹ کرنا سراسر خسارے کا سودا تھا۔ اس نے جلدی سے پینترا بدلا "کیسی باتیں کرتے ہیں اشفاق بھائی۔ بیٹے کی اہمیت کو مجھ سے زیادہ کون سمجھتا ہوگا۔ میں اس چیز کے پیسے لوں گا' جو چندو نے کھائی ہو۔ توبہ توبہ۔" وہ اپنا منہ پیٹنے لگا۔

○

ٹھیک اسی وقت شہر کے ایک اور علاقے میں' ایک گھر میں سلمی بیگم میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ بچے اسکول سے واپس آکر ہاتھ منہ دھو رہے تھے "آجاؤ بھئی' کھانا کھالو۔" انہوں نے پکارا۔

تین سالہ فیاض پہلے ہی اچھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "امی جلدی سے کھانا دیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"ذرا سا صبر کرلو بیٹے۔ آپا اور بھائی آجائیں۔" سلمی بیگم نے اسے تسلی دی۔

اتنی دیر میں اسکول سے آنے والے دونوں بچے بھی ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھے۔ سلمی بیگم نے ڈش پہلے نو سالہ میمونہ کی طرف بڑھائی" آپ لیں نا امی۔" میمونہ نے کہا۔

"تم نکالو۔ میں لے لوں گی۔"

میمونہ نے ڈش کا ڈھکنا اٹھایا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر مایوسی جھلکی مگر فوراً ہی وہ تاثر مٹ گیا۔ سلمی بیگم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دیں

مگر اس مسکراہٹ میں دکھ بھی تھا۔ ان کی بچی وقت سے پہلے بڑی اور سمجھ دار ہوگئی تھی۔

میمونہ نے پلیٹ میں سالن نکالا اور روٹی لی پھر اس نے ڈش چھ سالہ اشعر کی طرف بڑھا دی "امی ....!" اشعر کے لہجے میں احتجاج تھا۔

سلمی بیگم سبب جانتی تھیں۔ ان کا دل کٹ کر رہ گیا "بیٹے' میری جان' کھانا کھالو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔"

اشعر نے خاموشی سے سالن نکالا ..... بہت تھوڑا سا۔ اس کے انداز میں بے دلی تھی۔

"اور لو ..... اچھی طرح کھانا کھاؤ۔"

"بس امی' زیادہ بھوک نہیں ہے۔"

سلمی بیگم کو اندازہ تھا کہ بھوک کتنی تھی .... اور اس کے اڑنے کا سبب کیا ہے۔ وہ ملول ہو کر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا' روٹی لی اور پہلا نوالہ توڑ کر فیاض کی طرف بڑھایا "لو بیٹے' منہ کھولو۔"

"امی' میں یہ نہیں کھاؤں گا۔ مجھے گوشت چاہیے۔" تین سالہ فیاض کو حالات سے غرض نہیں تھی۔ صبر کا مفہوم اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بس دل کی بات کہہ رہا تھا۔

"آج یہ کھالو۔ میرا وعدہ ہے کہ کسی دن تمہیں جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی۔" سلمی بیگم نے کہا "اب منہ کھولو۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ آج میں گوشت کھاؤں گا بس۔"

"بیٹے' کچھ دن صبر کرلو۔ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گی۔ اچھا' کل میں گوشت سے بھی زیادہ مزے کی ایک چیز پکاؤں گی۔"

گوشت سے زیادہ مزے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں تو گوشت ہی کھاؤں گا۔" فیاض نے ضد کی۔

سلمی بیگم نے بہلا پھسلا کر فیاض کو کھانا کھلایا۔ انہوں نے اصرار کر کے اشعر کو بھی ٹھیک طرح سے کھانے پر مجبور کیا۔ میمونہ نے خود ہی پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

"چلو' اب تم دونوں اپنے بیڈ روم میں جا کر سو جاؤ۔" سلمی بیگم نے دونوں بیٹوں سے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے اماں!" فیاض بولا۔

"ٹھیک ہے' اشعر تم سو جاؤ۔ پھر اٹھ کر ہوم ورک کرلینا۔"

اشعر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میمونہ نے برتن دھلوانے میں ماں کی مدد کی۔ فیاض ادھر ادھر ڈولتا پھرا۔ پھر اس نے کہا "امی' میں آنگن میں سائیکل چلا لوں؟"

"چلا لو بیٹے۔"

سلمی بیگم برتن دھلوانے اور کچن کی صفائی سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ کال بیل بجی۔ انہوں نے جاکر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ان کی پڑوسن صفیہ کھڑی تھیں۔ سلمی بیگم ابھی چند روز پہلے ہی ان کے گھر گئی تھیں۔ صفیہ پہلی بار ان کے گھر آئی تھیں۔

"آیئے نا..... تشریف لایئے۔" سلمی بیگم نے بے حد تپاک سے کہا۔

صفیہ اندر آگئیں "کیسی ہیں آپ؟ میں نے سوچا آپ سے مل لوں۔ اس وقت فرصت ہے۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے۔ کبھی کوئی کام نہ ہو تو میرا بھی دل گھبرانے لگتا ہے۔ آیئے' ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر صفیہ کی آنکھیں پھیل گئیں "گھر خوب ڈیکوریٹ کیا ہے آپ نے۔" انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا "صوفے تو بہت ہی خوب صورت ہیں۔"

"جی ہاں۔"

صفیہ ٹی وی ٹرالی کی طرف متوجہ ہوگئی "اوہ..... یہ سونی ۲۶ انچ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" سلمی بیگم کو وحشت ہونے لگی "یہ بتائیں' چائے پئیں گی یا ٹھنڈا؟"

"تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں تو باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"باتیں کرلیں گے۔ آپ بتائیں تو۔"

"چائے پلا دیں۔"

سلمی کچن میں گئیں اور چائے بنا کر لے آئیں۔ چائے کی پیالی انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"آپ نہیں پئیں گی؟"

"میں تو ابھی کھانے کے بعد چائے پی کر بیٹھی ہوں۔ ایسی عادت ہے کہ کھانے کے بعد چائے کے بغیر رہا ہی نہیں جاتا۔" سلمی بیگم نے کہا۔ حالانکہ وہ پریشان تھیں۔ چائے کی پتی اور چینی دونوں ختم ہونے والی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ صبح تک کام چل سکتا تھا۔

"آپ کا گھر اور گھر کی ہر چیز مجھے بہت اچھی لگی ہے۔" صفیہ نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "آپ کا ذوق بھی بہت اچھا ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"اللہ پیسہ دے تو ذوق بھی دے ورنہ میں نے تو بڑے بڑے بے ڈھنگے لوگوں کے پاس دولت ضائع ہوتے دیکھی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے بس۔ اس کا کرم ہے۔" سلمی بیگم نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دباتے ہوئے کہا۔

Rehan Ahmed http://www.rehanahmeds.com

عین اسی وقت شہر کے ایک بہت بڑے یتیم خانے میں بچوں کو کھانا دیا جا رہا تھا۔ بچوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ باورچی پلیٹ میں پتلی دال ڈال کر رکھے جا رہا تھا۔ یتیم خانے کا ایک ملازم سامنے آنے والے بچے کو روٹی پکڑاتا۔ بچہ دال کی پلیٹ اٹھاتا اور ایک طرف جا بیٹھتا۔

اصغر نے پہلا لقمہ توڑا ہی تھا کہ اس کی نظر اختر پر پڑی۔ وہ کھانا لینے بھی نہیں گیا تھا اور منہ پھلائے بیٹھا تھا "تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ مجھے یہ پتلی دال نہیں کھانی۔" اختر نے تند لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا کھاؤ گے؟"

"میں گوشت کھاؤں گا۔"

"وہ کہاں سے ملے گا؟"

"مجھے پتا ہے' باورچی خانے میں ہر روز گوشت ہوتا ہے۔ گوشت پکتا ہے۔"

"مگر وہ ہمارے لئے نہیں ہوتا۔" اصغر نے دکھے دل سے کہا۔

"میں ابھی بات کروں گا۔"

اصغر نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔

اختر اور اصغر میں ابتدا ہی سے دوستی ہوگئی تھی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ ان کی عمر ۷ سال کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے ہوش یتیم خانے ہی میں سنبھالا تھا۔ اس سے پہلے کا انہیں کچھ یاد نہیں تھا۔ دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا اسی لئے ان کی دوستی پر سب حیرت کرتے تھے۔ اختر بہت تیز و طرار اور چالاک تھا۔ وہ ضدی اور خود سر بھی تھا اسی لیے اس کی اکثر پٹائی بھی ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اصغر ڈرپوک تھا۔ وہ

کسی سے الجھتا ہی نہیں تھا۔

تمام بچے نمٹ گئے۔ کاؤنٹر خالی ہو گیا۔ کاؤنٹر پر البتہ دال کی پلیٹیں اب بھی رکھی تھیں۔ اختر اٹھا اور اس طرف چل دیا۔

باورچی نے اسے حیرت سے دیکھا "تو نے کھانا نہیں لیا۔"

"مجھے گوشت کھانا ہے۔"

باورچی کی آنکھوں میں ایک پل کو حیرت جھلکی اور پھر غصے کی چمک نظر آئی "دماغ ٹھیک ہے تیرا؟"

"ٹھیک ہے۔ بس، میں گوشت کھاؤں گا۔"

"تو کھالینا۔ پہلے اپنا گوشت کاٹ کر مجھے دے تاکہ وہ میں تیرے لئے پکا دوں۔" باورچی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"گوشت تو پکا ہے۔" اختر نے بڑے سکون سے کہا۔ "تم لوگوں نے کھایا بھی ہے۔ بچے ہوئے میں سے مجھے بھی دے دو۔ تمہارا کیا جائے گا۔"

"یہ جائے گا کہ تیری دیکھا دیکھی سب مانگیں گے اور یتیم خانہ مچھلی مارکیٹ بن جائے گا۔"

"تم مجھے نہیں دو گے تو بھی سب کو معلوم ہو جائے گا۔" اختر نے دھمکی دی۔

"دھونس جماتا ہے۔" باورچی کو غصہ آگیا "جا .... جا کے شاہ صاحب سے بات کر۔ وہ تجھے گوشت کھلائیں گے اچھی طرح۔"

اختر کھسیا گیا۔ شاہ صاحب یتیم خانے کے منتظم تھے۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔ ان کے کمرے سے کسی بچے کا بلاوا آتا تو اس کا پیشاب خطا ہو جاتا۔ شاہ صاحب بڑی بے دردی سے مرمت کرتے تھے اور سچ مچ کھال اتار کر رکھ دیتے تھے۔

"یہ دال لے جا، میں تجھے روٹی دیتا ہوں۔ جا، کھانا کھا لے۔" باورچی نے نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں کھانی مجھے دال۔" اختر نے چلا کر کہا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا گیا اور اپنی جگہ جا بیٹھا۔

"کھا لو یار۔ تمہارے بھوکے رہنے کا کسی کو دکھ نہیں ہوگا..... سوائے

میرے۔" اصغر نے بڑے پیار سے کہا۔

"تو چپ رہ۔ میں دال نہیں کھاؤں گا۔"

○

گھر پہنچ کر باجی نے واقعی چندو کی اچھی طرح خبر لی۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ تو ان کا لاڈلا تھا۔ وہ ان کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور زندگی کی رونق تھا۔ وہ تو اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ کسی بڑی سے بڑی شرارت پر بھی انہوں نے کبھی اسے مارا نہیں تھا۔ معاملہ ناقابل برداشت ہوتا تو وہ اسے خوب ڈانٹتیں اور کبھی سزا بھی دیتیں۔ سخت ترین سزا وہ اسے آج دینے والی تھیں۔

وہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ چندو بھی ان سے محبت کرتا تھا۔ وہ ان کا ایسا فرماں بردار تھا کہ کبھی انہیں کوئی بات دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ ان کی ہر بات نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ جانتا تھا۔

اس وقت بھی وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے اور باجی غصے میں ہیں۔ وہ سر جھکائے چلتا ہوا گھر آیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باجی نے کہا "چندو، آپ میرے کمرے میں چلیں۔"

چندو مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ باجی نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اپنی مسہری پر بیٹھ گئیں۔ چندو ان کے سامنے کھڑا تھا" چندو، آج آپ نے بری حرکت کی ہے۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی ہے۔"

چندو انہیں دیکھ رہا تھا مگر جب انہوں نے چندو کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"آپ نے باہر بلا اجازت کسی کی چیز کھا کر کیا ثابت کیا۔" باجی شدید غصے کے عالم میں آپ جناب کرتی تھیں "یہی نا کہ آپ کے ماں باپ نے آپ کی اچھی تربیت نہیں کی اور یہ بھی کہ آپ کو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ آپ بھوکے رہتے ہیں اس لئے آپ کو چوری کرنی پڑتی ہے۔" وہ کہتے کہتے رکیں "جی ہاں، یہ چوری ہے جناب۔ بغیر اجازت کے کسی کی چیز لینا چوری ہے اور اسلام میں اس کی سزا ہاتھ کاٹنا

ہے۔ سمجھے کچھ۔"

چندو شرم سار کھڑا تھا۔

"لیکن آپ سزا کے بغیر سمجھیں گے بھی نہیں۔ ہے نا بیٹے۔ تو آج پھر آپ کو سخت سزا ملے گی۔ اب آپ ایسا کیجئے کہ اس کونے میں جایئے اور دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہو جایئے اور جب تک میں نہ بلاؤں' یوں ہی کھڑے رہیے۔"

چندو خاموشی سے کمرے کے اس کونے میں چلا گیا' جس کی طرف باجی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ اس کے انداز تک سے شرمندگی ہویدا تھی۔ باجی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کا دل فخر اور محبت سے سرشار ہوگیا۔ آج کل ایسے سعادت مند بیٹے کہاں ہوتے ہیں۔ چوں بھی نہیں کی بچے نے ..... اور کونے میں جاکر کھڑا ہوگیا۔

مگر چند منٹ بعد باجی کا دل دکھنے لگا۔ چندو ساکت وصامت کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تھا' نہ اس نے پہلو بدلا تھا۔ معصوم بچے کو ایسی کڑی سزا! باجی کو اپنا دل کٹتا محسوس ہوا۔ ان کا جی چاہا کہ اسے بلائیں اور لپٹا کر پیار کریں مگر نہیں۔ انہوں نے سوچا' یہ سزا ضروری ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ باہر کسی کو چندو سے نقصان پہنچا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لئے سزا ضروری ہے۔ مگر اب ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے یوں کھڑا دیکھتی رہیں۔ وہ ادھر ادھر پھرتی پھریں۔ سوچا کوئی کام ہی کرلیں مگر کچھ نہیں سوجھا۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ چندو نے جانے کتنا نقصان کیا ہوگا۔ اس کی تلافی پہلے کر دیں۔ انہوں نے بیگ کو ٹٹولا۔ اس میں چھ سو سے زائد روپے تھے۔ بیگ لے کر گھر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چندو سے کہا "دیکھو چندو' میں تیرا کیا دھرا بھگتنے جا رہی ہوں۔ تو یہاں سے ہلا بھی تو بہت پٹائی کروں گی۔ میں واپس آؤں تو یہیں کھڑا ملے تو۔ سمجھ گیا۔" اب جب کہ ان کا غصہ سرد ہو چکا تھا تو آپ جناب کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔

چندو نے پلٹ کو ایک نظر انہیں دیکھا' سرہلایا اور دوبارہ پہلے ہی کی طرح کھڑا ہوگیا۔ باجی گھر سے نکل آئیں۔ گلی میں چند قدم چلنے کے بعد انہیں خیال آیا کہ چندو موقع پاکر کونے سے ہٹ تو نہیں جائے گا۔ ذرا چل کر دیکھا جائے۔ حالاں کہ انہیں

چندو کی فرماں برداری پر اندھا یقین تھا مگر تربیت کرنے والے کو ایسے یقین پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ گھر کی طرف پلٹیں.....

"باجی' چندو کیسا ہے؟" حسینہ نے انہیں پکار کر پوچھا۔ وہ اسی وقت دروازے پر آئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ بس ذرا بد تمیز ہو گیا ہے۔"

"ارے باجی' اتنا تو نیک ہے۔"

باجی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔ صحن میں پہنچ کر وہ دبے قدموں کمرے کی طرف گئیں اور جھانک کر دیکھا۔ چندو اسی طرح کھڑا تھا' جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ وہ مسکرائیں اور پر اعتماد قدموں سے گھر سے نکل آئیں۔

○

باورچی نظام نے ظاہر تو نہیں کیا لیکن درحقیقت وہ اختر کی ضد سے ڈر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اختر کتنا سرکش اور سخت جان لڑکا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ معاملات کے بگڑنے سے پہلے شاہ صاحب کو سب کچھ بتا دینے ہی میں عافیت ہے۔ اس نے اس سلسلے میں فیضو سے بات کی "دیکھو فیضو' شاہ صاحب کو یہ بتانا ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے یہاں۔" فیضو نے بے پروائی سے کہا "ایسا ہوگا تو لڑکے دھمکی بھی دیں گے۔ ہے تو یہ زیادتی نا۔" یہ کہتے ہی فیضو کو احساس ہوا کہ اس نے بہت مخدوش بات کہہ دی ہے۔ شاہ صاحب تو اس کی بھی کھال کھینچ دیں گے۔ اس نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی "یہ دھمکیاں تو چلتی رہتی ہیں مگر کبھی کچھ ہوا نہیں۔"

"لیکن اس لڑکے کے تیور بہت خراب ہیں۔"

"ارے وہ اختر! وہ تو پدا ہے پدا۔ یہاں تو بڑے بڑے ٹھیک ہو گئے۔"

"وہ ہے تو چھوٹا مگر میں جانتا ہوں' وہ بہت خطرناک ہے۔"

نظام نے کہا۔

"تو بھائی تم خود ہی شاہ جی سے بات کرلو۔"

"شاہ صاحب تو ابھی ہیں نہیں۔ میں چاہتا ہوں، تم ذرا اختر پر نظر رکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ میں کرلوں گا۔"

فیضو اختر کی تلاش میں نکلا۔ سب سے پہلے تو یہ پتا چلا کہ اختر نے صرف کھانے پینے سے ہی نہیں، پڑھنے سے بھی انکار کردیا ہے۔ وہ کسی سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ ہر بات کے جواب میں وہ یہی کہتا تھا کہ میں تو گوشت کھاؤں گا۔

فیضو نظام سے متفق ہوگیا۔ معاملہ واقعی خطرناک تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نظام کو رپورٹ دیتا رہا۔

شام کو نظام نے اسلام الدین سے جو شاہ صاحب کے دفتر کا انتظام سنبھالتا تھا، شاہ صاحب کے متعلق پوچھا "شاہ صاحب آ تو گئے ہیں۔" اسلام الدین نے بتایا "لیکن اس وقت ایک مہمان ہے ان کے پاس۔"

عام طور پر ایسے موقعوں پر شاہ صاحب کو ڈسٹرب نہیں کیا جاتا تھا لیکن نظام کے نزدیک اختر والا معاملہ ایمرجنسی کا تھا۔ جیسے جیسے رات کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا، اسے ہول چڑھ رہا تھا، اسے شاہ صاحب سے جلد از جلد ملنا تھا۔

○

دین محمد نے باجی کو روبرو دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس نے سوچا، شاید کامل کی برائی کی دوسری قسط منظر عام پر آنے والی ہے مگر پھر باجی کے چہرے کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ ان کے چہرے پر نرمی ہی نرمی تھی۔

"کیا حکم ہے باجی؟" اس نے پھر بھی ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم یہ بتاؤ کہ چندو نے تمہارا کتنا نقصان کیا ہے۔"

"نقصان کیسا باجی۔ نقصان تو ضائع ہونے والی چیز کا ہوتا۔ جو پیٹ میں گیا، وہ نقصان تو نہیں کہلائے گا۔" دین محمد نے کہا "اور چندو تو میرے لیے بھی بیٹے کی طرح ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ اللہ نے مجھے بیٹے سے نہیں نوازا ہے۔" اس نے لہجے میں رقت سمونے کی کوشش کی۔

"یہ باتیں چھوڑو۔ چندو میرا بیٹا ہے' تمہارا نہیں۔ تھوڑے سے بادام پستے کے بدلے تم میرے بیٹے میں حصہ بٹانا چاہتے ہو۔" باجی نے خراب لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں باجی۔ بیٹا تو وہ آپ ہی کا ہے۔ ہم تو اسے دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔"

"یہ تمہاری محبت ہے۔" باجی نے نرم لہجے میں کہا "مگر میرے لیے تمہارا یہ نقصان پورا کرنا ضروری ہے۔"

دین محمد سمجھ گیا کہ باجی نہیں مانیں گی "اب میں حساب کیسے لگاؤں باجی۔ چندو نے تول کر تو نہیں کھایا تھا۔"

باجی سوچ میں پڑ گئیں۔ بات دین محمد کی درست تھی "تم اندازے سے بتا دو۔ کمی بیشی ہم دونوں اللہ کے سامنے ایک دوسرے پر معاف کردیں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں' اس کی ضرورت ہی نہیں باجی۔ گھر کی بات ہے۔"

"ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں چندو کسی اور کی کوئی چیز کھائے۔"

"تو پھر جو جی چاہے' دے دیں۔" دین محمد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

باجی نے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے "اس کے بعد بھی اگر تمہارا حساب میرے طرف نکلے تو ابھی معاف کردو۔"

"یہ تو زیادہ ہیں باجی۔" دین محمد نے احتجاج کیا۔

"بس رکھ لو۔" باجی نے کہا "اب میں چلتی ہوں۔"

دین محمد انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

اس بار بھی باجی دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئیں اور کمرے کی طرف گئیں۔ چندو اسی طرح کونے میں کھڑا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ہلا بھی نہیں ہے۔ باجی نے بیگ ڈریسر پر رکھا اور مسہری پر بیٹھ گئیں۔ اب کے انہیں چندو پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ "چندو.... اے چندو۔" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پکارا۔

لیکن چندو نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے باجی کو گمان ہوا کہ چندو ان سے ناراض ہوگیا ہے۔ مگر فوراً ہی ان کے ذہن نے اس خیال کو رد کر دیا۔

انہوں نے چندو سے کہا تھا کہ جب تک وہ نہ کہیں، وہ ہلے بھی نہیں۔ وہ محض ان کی پکار پر پلٹ کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے اسے پلٹنے کو تو نہیں کہا تھا۔

"چندو، مڑ کر کھڑا ہو اور میرے طرف دیکھ۔"

چندو نے اس بار رخ ان کی طرف کر لیا لیکن نظریں نہیں اٹھائیں۔

"میری طرف دیکھ۔" باجی نے بڑے لاڈ سے کہا۔

اس بار چندو نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں اور انہیں دیکھا۔

"پتا ہے، میں دکان دار کو پیسے دے آئی ہوں۔ میرا چندو کوئی مفت کی چیز نہیں کھاتا ہے۔" باجی نے کہا "اور ہاں، دیکھ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

چندو نے سرہلا کر وعدہ کر لیا۔ اب تک اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

"مجھ سے ناراض ہے؟"

چندو نے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں سرہلایا۔

"ادھر آ، میں تجھے پیار کروں۔"

چندو دھیرے دھیرے باجی کو طرف بڑھا۔ باجی نے اسے لپٹاتے ہوئے ننھے منے بوسوں سے بھگو دیا۔ وہ اسے دیوانہ وار پیار کر رہی تھیں۔

پھر اچانک چندو دونوں پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا، اس نے دونوں اگلے پیر باجی کے کندھوں پر رکھے اور ان کے چہرے پر پیار کرنے لگا۔ وہ انہیں سچ مچ پیار کر رہا تھا، چاٹ نہیں رہا تھا۔ جانور تو عموماً" چاٹتے ہی ہیں۔ کوئی اس وقت اسے دیکھتا تو ایک لمحے کے لئے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا کہ وہ دنبہ ہے۔ وہ باجی کے رخسار پر تھوتھنی رکھ کر زبان نکالے بغیر انہیں پیار کر رہا تھا۔

"میرا بیٹا ..... میرا چندو ..... میری جان!" باجی کو اس پر لاڈ آنے لگا "چندو، مجھے ناچ کر تو دکھا۔"

چندو اترا، اس نے دوسری طرف رخ کیا اور چکتی ہلا ہلا کر اپنے مخصوص انداز میں تھرکنے لگا۔ باجی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ "چکتی تیری بہت بڑی ہو گئی ہے رے چندو۔ کچھ باقی جسم میں بھی لگالیا کر۔ کاش میرے پاس بہت پیسہ ہوتا اور میں تجھے خوب اچھی طرح کھلا پلا سکتی۔"

Rehan

چند قدم لپک کر آیا اور ان کی پنڈلیوں پر پیشانی رگڑنے لگا۔

○

"آپ جیسے لوگ بڑے اجر کا کام کرتے ہیں۔" شاہ صاحب صدیقی صاحب سے کہہ رہے تھے "یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا، ان کی مدد کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند ہے۔"

"آپ خوش نصیب ہیں شاہ جی! سر پر ان کے آپ ہاتھ رکھتے ہیں۔ آپ ان کی دل جوئی کرتے ہیں۔" صدیقی صاحب بولے "ہم تو بس پیسے سے مدد کرتے ہیں اور پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ کبھی بہت جی چاہتا ہے کہ عملاً بھی کچھ کروں۔ یہ لیجئے اس ماہ کا چیک۔"

شاہ صاحب نے چیک کا جائزہ لیا اور مایوسی سے بولے "وہی ایک لاکھ۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے جناب کہ گزارہ مشکل ہوگیا ہے۔ پچھلے ماہ آپ نے فرمایا تھا......"

"مجھے یاد ہے ...... اور مجھے مہنگائی کا احساس بھی ہے شاہ صاحب۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں خجالت تھی "آپ تو جانتے ہیں کہ ہم سات آدمی مل کر یہ رقم دیتے ہیں۔ میں نے ساتھیوں سے بات کی تھی۔ وہ فی الحال رقم بڑھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔ وہی آبرو رکھنے والا ہے۔" شاہ صاحب رقت آمیز لہجے میں بولے "اب تک تو میں نے ایک وقت کا بھی فاقہ نہیں ہونے دیا۔ یہ نوبت آئی تو ان بچوں سے پہلے میرے اپنے بچے فاقہ کریں گے۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"آپ فکر نہ کریں شاہ صاحب!" صدیقی صاحب ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں نے کچھ اور لوگوں سے بھی بات کی ہے۔ ایک دو ماہ میں رقم بڑھ جائے گی انشاء اللہ۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور اگلے ہی لمحے نظام اندر آگیا۔ اس نے ادب سے دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے نظام؟" شاہ صاحب نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

http://www.rehanahmeds.com
Ahmed
Rehan
http://www.rehanahmeds.com
Ahmed

"وہ جی شاہ صاحب، اختر بہت گڑ بڑ کر رہا ہے۔" نظام نے کہا۔ "اس نے جی دوپہر کھانا نہیں کھایا ہے، کہتا ہے رات کو بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"لیکن کیوں؟"

نظام نے کن انکھیوں سے صدیقی صاحب کو دیکھا، جو یہ گفتگو بڑے غور سے سن رہے تھے پھر بولا "وہ کھانے کو گوشت مانگتا ہے جی۔"

شاہ صاحب کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی پھر بڑی تیزی سے انہوں نے خود کو سنبھال لیا "اچھا، تم جاؤ۔ میں بلا کر سمجھا دوں گا اسے۔"

"بہتر جناب!" نظام چلا گیا۔

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ صدیقی صاحب انہیں مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب آپ ہی دیکھ لیں صدیقی صاحب! ہم تو ان محروم لوگوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو، پل صراط پر چلنا پڑتا ہے۔ ہر لمحے۔ سوچیں کہ یہ اختر کس مان سے گوشت کا تقاضا کر رہا ہے۔ اس وقت میرا دل کٹ کر رہ گیا ہے اور میں اس کی یہ خواہش پوری کروں گا۔ ہوٹل سے گوشت منگوا کر کھلاؤں گا اسے۔"

صدیقی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ شاہ صاحب کا جذبہ دل کو چھو لینے والا تھا" آپ بہت عظیم انسان ہیں شاہ صاحب۔ آپ بہت بڑا کام کر رہے ہیں لیکن گوشت تو باقاعدگی سے آتا ہے آپ کے ہاں۔ ابھی کل ہی قریشی صاحب سے بات ہوئی تھی میری۔"

پورا کہاں پڑتا ہے صدیقی صاحب۔ ہزار سے اوپر بچے ہیں ہمارے پاس۔ جیسے تیسے کام چلا لیتے ہیں۔" شاہ صاحب نے دردناک لہجے میں کہا۔

صدیقی صاحب شرمندہ نظر آنے لگے "اللہ بہتر کرے گا۔ ویسے دیگیں بھی تو آتی رہتی ہیں۔ میں تو ہر جگہ آپ کی ہی بات کرتا ہوں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" شاہ صاحب نے پینترا بدلا۔ "آپ کی عنایت سے بچے روز گوشت کھانے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ایک دن بھی دال برداشت نہیں

ہوتی ان سے۔ انہیں تو اپنے یتیم ہونے کا احساس بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ ایسے فرمائشیں کرتے ہیں' جیسے اپنے گھر میں اپنے والدین سے بچے کرتے ہیں۔"

صدیقی صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں "اللہ آپ کو لمبی عمر اور لامحدود وسائل عطا فرمائے شاہ صاحب!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

صدیقی صاحب شاہ صاحب سے مصافحہ کرکے رخصت ہو رہے تھے کہ شاہ صاحب نے انہیں پکارا "حضرت ..... ایک التجا ہے۔"

صدیقی صاحب نے پلٹ کر انہیں دیکھا "حکم کیجئے شاہ صاحب"

"تین دن بعد بقر عید ہے۔ اس بار کھالوں کے سلسلے میں ہمارا خاص خیال رکھیے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ صاحب!"

صدیقی صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی شاہ صاحب کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ بے حد غضب ناک نظر آرہے تھے۔ "اسلام الدین!" انہوں نے چیخ کر پکارا۔ اسلام الدین کمرے میں آیا تو انہوں نے کہا "جاؤ ..... نظام کو بلا کر لاؤ۔"

○

"گوشت کو چھوڑو۔ بس پیٹ بھر جائے' اتنا کافی ہے۔" اصغر اختر کو سمجھا رہا تھا۔ اس وقت وہ نو سال کا بچہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ "گوشت کھانے کو صرف تمہارا ہی نہیں' میرا بھی دل چاہتا ہے۔ سب کا چاہتا ہوگا۔"

"میری طرح نہیں چاہتا ہوگا۔"

"تمہیں کیا پتا۔" اصغر نے آہ بھر کے کہا "میرا تو کبھی کبھی ایسا دل چاہتا ہے کہ اپنا ہی گوشت پکا کر کھالوں مگر میں جانتا ہوں کہ مانگنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ زیادہ تین پانچ کرو گے تو شاہ جی کھال کھینچ لیں گے اسی لئے میں صبر کرلیتا ہوں۔ صبر کا یہ مطلب نہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا۔"

"پھر تو بزدل ہے۔" اختر نے جوش اور غصے سے کہا "میں سب کچھ دیکھ کر چپ دل رہوں۔ یہاں مفت کا گوشت آتا ہے ..... ہمارے لیے اور ہمارے سوا سب کھا

جاتے ہیں۔ ہمیں ایک بوٹی بھی نہیں ملتی۔ دیگیں بھی ہمارے نام پر آتی ہیں۔ یہ لوگ کھاتے بھی ہیں اور بچتے بھی ہیں۔ ہمیں ایک نوالہ بھی نہیں ملتا۔"

"مگر ہم کچھ کر نہیں سکتے۔"

"تو نہیں کر سکتا ہوگا۔ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور کروں گا۔"

اسی لمحے اسلام الدین آگیا "چل اختر، تجھے شاہ جی نے بلایا ہے۔"

اصغر کا تو رنگ فق ہوگیا لیکن اختر گوشت کی طلب کے نشے میں سرشار تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن شاہ جی کے کمرے میں شاہ جی کے تیور دیکھ کر وہ بھی ڈر گیا۔ شاہ جی نے اسلام الدین سے کہا "تو باہر جا۔ میں بعد میں تجھے آواز دے لوں گا۔"

اسلام الدین کے جانے کے بعد شاہ جی نے اختر کو بہت غور سے دیکھا "ہاں شہزادے، تو بہت کمزور لگ رہا ہے۔ کیا بات ہے؟"

وہ نرم لہجہ اور ڈرا دینے والا تھا۔ اختر نے دل کڑا کر کے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں شاہ جی۔"

"سنا ہے، آج تو نے کھانا بھی نہیں کھایا؟" شاہ جی بولے۔ "مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، میں نے کچھ اور تشویش ناک باتیں سنی ہیں۔ نظام بتا رہا تھا کہ جب تک گوشت نہیں ملے گا، تو کھانا نہیں کھائے گا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی شاہ صاحب۔"

"مجھے افسوس ہے اس لئے کہ اس صورت میں تو بھوک کی وجہ سے مرجائے گا۔ زندہ رہنا ہے تو تجھے ضد چھوڑنی ہوگی، جو ملے گا کھانا ہوگا ورنہ تو بھوکا مرجائے گا۔ کسی کو کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا اس لئے کہ تیرا کوئی رونے والا بھی نہیں۔" شاہ جی نے سرد لہجے میں کہا۔

یتیم خانے کی زندگی نے نو سالہ اختر کو عمر سے بڑا بنا دیا تھا مگر آخر وہ تھا تو بچہ ہی۔ وہ سہم گیا۔ موت کا تصور ہی بہت خوف ناک تھا۔ اس نے سوچا، واقعی میرا کوئی رونے والا بھی نہیں، سوائے اصغر کے۔ وہ تو لازماً روئے گا "شاہ جی، میں چلی

بھر کے گوشت نہیں مانگتا۔ بس مجھے ایک بوٹی اور تھوڑا سا سالن لادو۔ پچھلی بقر عید سے بھی پہلے میں نے گوشت کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک گوشت دیکھا بھی نہیں ....." وہ گڑگڑایا۔

"میں تجھے خواہ مخواہ کمزور سمجھ رہا تھا۔ تجھ میں تو بڑی طاقت ہے۔ ہاں تو نے ساری طاقت زبان میں لگا دی ہے۔ کیسے فرفر بولتا ہے۔"

"شاہ جی' خدا کے لئے' مجھے ایک بوٹی دے دو۔" اختر کی ساری اکڑ نکل گئی۔ وہ ایسے گڑگڑا رہا تھا' جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔

ایک دم شاہ جی کے تیور بدل گئے "سالے حرام زادے' تیرا باپ یہاں گوشت رکھوا کر گیا تھا کہ میں تجھے گوشت کھلاؤں۔ کتے کے پلے' کھاتا ہے اور غراتا ہے۔ اپنی اوقات بھی نہیں پہچانتا۔ یہ نہ بھولا کر کہ تو یتیم ہے ..... بلکہ ہو سکتا ہے' حرامی ہی ہو۔"

گالیوں سے اختر کا کچھ بھی نہیں بگڑ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سننے کا تو وہ بچپن ہی سے عادی تھا۔ البتہ اس کی اکڑ عود کر آئی۔ اس نے کہا۔ "شاہ جی' میں گوشت کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا۔ چاہے مرجاؤں۔"

"تو بھوک سے نہیں' میرے ہاتھوں سے مرے گا۔"

"دیکھیں شاہ جی' اتنا گوشت آتا ہے۔ سارے نوکر کھاتے ہیں۔ آپ کے گھر بھی جاتا ہے۔ ایک بوٹی مجھے دیں۔ قسم سے' میں کب سے ترس رہا ہوں ایک بوٹی کے لئے۔ آپ کا کیا جائے گا۔ شاہی جی۔" اس نے بے حد لجاجت سے کہا۔

اپنے گھر گوشت جانے کا حوالہ سن کر شاہ جی کا چہرہ لال بھبو کا ہوگیا۔ وہ الماری کی طرف گئے اور بید کی چھڑی نکال لی۔

اختر کو اندازہ ہوگیا کہ اب پٹائی ہوگی اور شنوائی نہیں ہوگی۔ اس نے سوچا' جلدی جلدی اپنی بات تو کہہ دے۔ دل میں کچھ نہ رہ جائے۔ اس نے دیگوں کا حوالہ دیا۔ یتیم خانے کے لئے آنے والے عطیات اور چندے کا تذکرہ کیا۔ یوں وہ شاہ صاحب کی آتش غضب کو اور بھڑکاتا رہا۔

شاہ جی اب غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے "تو سمجھتا ہے' یہ سب تیرے لیے آتا ہے ..... تیری وجہ سے آتا ہے۔" ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں شاہ جی' میری نہیں ..... سب یتیموں کی وجہ سے آتا ہے۔" اختر اب بھی گڑگڑا رہا تھا۔

"غلط۔" شاہ جی دہاڑے "یہ سب میرے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ اگر میں نکال دوں سب کو ..... تو کوئی نہیں پوچھے گا تمہیں۔ بھیک مانگتے پھرو گے' بھیک بھی نہیں ملے گی۔ کتے کے پلے' حرام کے جنے' گندی نالی کے کیڑے ..... تجھے میں پناہ نہ دیتا تو جھاڑو لگا رہا ہوتا کہیں ....."

"شاہ جی ! خدا کے لئے' مجھے ایک بوٹی دلوا دیں۔" آختر پھر گڑگڑایا۔ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ابھی دیتا ہوں ..... لیکن تیرے اپنے جسم سے اتار کر۔" شاہ جی نے غرا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چھڑی سے اندھا دھند اس کی دھنائی شروع کر دی۔

اختر نے پہلی بار شاہ صاحب کا چھڑی والا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا تو خوف نے اسے جکڑلیا مگر پہلی چھڑی جسم پر لگتے ہی اس کے وجود میں سرکشی اور بغاوت کی ایک تند موج اٹھی۔ اسے ایسا لگا' جیسے اس کا جسم پتھر کا ہوگیا ہے۔ اسے تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بس اس نے اتنا کیا کہ دونوں ہاتھوں سے سر اور چہرہ چھپالیا۔

شاہ جی مارنے کے ساتھ ساتھ مغلظات بھی بک رہے تھے۔

"شاہ جی ' اب تو میں سب کو بتاؤں گا کہ ہمیں کیا ملتا ہے۔" اختر چھڑی کی ہر چوٹ سے بلبلا کر چیختا "جو لوگ ہمارے لئے تمہیں چندہ دینے آتے ہیں' میں انہیں بتاؤں گا۔ جو دیگیں لے کر آتے ہیں' میں انہیں بتاؤں گا۔ میں یتیم خانے کے تمام بچوں کو بتاؤں گا۔ وہ سب پوری دنیا کو بتائیں گے۔" اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کیا بول رہا ہے "تم ہمارا گوشت کھا رہے ہو۔ تم آدم خور ہو۔" اس کا ہذیان بڑھتا گیا "میں سب کو بتاؤں گا کہ تم کیا ہو ....."

شاہ جی کا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سن رہے تھے مگر درحقیقت کچھ بھی نہیں سن رہے تھے۔ ہاں' ان کا ذہن اختر کے کہے ہوئے ہر لفظ کو ریکارڈ کر رہا تھا۔ اختر گر گیا۔ وہ پھر بھی اسے مارتے رہے مگر دھمکی سن کر ان کا ہاتھ رک گیا "تو کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔" انہوں نے وحشیانہ لہجے میں کہا "اس لیے کہ اس سے پہلے ہی میں تجھے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دوں گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ کسی کو تیری کمی کا احساس نہیں ہوگا۔ تیرا ہے ہی کون۔"

"ہاں ..... یہ ضرور کرلینا۔" اختر بھی چیخ رہا تھا "ورنہ میں سب کو بتا دوں گا کہ تم شیطان ہو مگر مجھے مارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھ جیسے اور بھی ہیں یہاں۔"

شاہ صاحب کی چھڑی پھر حرکت میں آگئی۔ یہ احساس بھی انہیں کچھ دیر بعد ہوا کہ اختر دیر سے خاموش ہے۔ انہوں نے ہاتھ روکا اور نیچے پڑے ہوئے اختر کو دیکھا۔ انہیں ڈر لگا کہ کہیں وہ مر ہی نہ گیا ہو۔ وہ سوچنا چاہتے تھے۔ کرسی کی طرف بڑھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ ہانپ رہے ہیں۔

وہ ساکت وصامت پڑے اختر کو دیکھتے اور سوچتے رہے۔ لڑکا بہت سرکش اور سخت جان تھا۔ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ انہیں اس کے لئے کچھ کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اسلام الدین کو پکارا۔ اسلام الدین آیا تو انہوں نے فرش پر پڑے ہوئے اختر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے لے جاؤ اور کوٹھری میں بند کردو۔ خیال رکھنا' کوئی لڑکا اس سے ملنے نہ پائے۔ اسے تنہا اور قید رکھنا ہے۔"

اسلام الدین نے اختر کو دیکھا اور جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پٹنے کے بعد اتنے برے حال میں اس نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

○

ریاض احمد بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ بمشکل پون کلومیٹر تھا مگر وہ انہیں بہت بھاری لگ رہا تھا اور تو اور بریف کیس انہیں بوجھ

لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس میں انشورنس کلیم کے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ قدموں سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا مگر یہ سب کچھ جسمانی نہیں تھا۔ کندھے ان کے حالات نے جھکا دیے تھے اور وقت کی گردش نے قدموں کو بوجھل کر دیا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے' جیسے جادو کے زور سے سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ ان کے جھکے ہوئے کندھے اٹھ گئے۔ قدموں میں چستی آگئی۔ چہرے سے تھکن مٹ گئی۔ یہ تبدیلی لاشعوری تھی۔ وہ پڑوسیوں پر کسی پریشان حال آدمی کا تاثر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی پریشانیاں گھر بھی نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ بچے جو کچھ جھیل رہے تھے' ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

گلی میں داخل ہوتے ہی انہیں امداد صاحب نظر آگئے۔ امداد صاحب برابر والے گھر میں رہتے تھے۔ علاقے کے اور لوگوں کی طرح امداد صاحب بھی خوش حال کاروباری تھے "السلام علیکم امداد صاحب!" ریاض احمد نے اپنی گونج دار آواز میں انہیں پکارا۔

امداد صاحب نے سر گھما کر انہیں دیکھا "آہا..... ریاض صاحب ہیں۔" انہوں نے بڑھ کر ریاض احمد سے مصافحہ کیا۔

"اور کیسے مزاج ہیں؟" ریاض احمد نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" امداد صاحب نے انہیں سرتاپا دیکھا۔ عمدہ سلا ہوا نفیس کپڑے کا سوٹ' چمک دار جوتے اور ٹائی جو میچنگ کے اعلیٰ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ اس پر شخصیت۔ امداد صاحب نے سوچا' اس شخص کے چہرے سے اور ہر انداز سے خوش حالی اور فراغت کا اظہار ہوتا ہے" مجھے تو آپ پر رشک آتا ہے ریاض صاحب !"

"کس سلسلے میں جناب؟"

"اب یہی دیکھیے کہ آپ صبح کے گئے رات کو واپس آرہے ہیں مگر ماشاء اللہ

کتنے فریش لگ رہے ہیں۔ میں تو دکان سے آتا ہوں تو اتنا برا حال ہوتا ہے کہ گلی میں کوئی جاننے والا مل جائے تو شرمندگی ہونے لگتی ہے۔"

"اللہ کا کرم ہے اور اپنے بارے میں آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔" ریاض احمد نے مسکراتے ہوئے کہا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں بھرم رکھنے کا ظرف عطا فرمایا۔

"جی نہیں۔ یہ سچ ہے۔" امداد صاحب بولے "بھئی سچ پوچھیں تو مجھے آپ کی آمد کی بڑی خوشی ہے۔ اچھا پڑوسی اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ پڑوس کا گھر غیر آباد ہو تو بہت برا لگتا ہے مگر برا پڑوسی اس سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں آپ جیسے اچھے پڑوسی ملے۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں مجھے۔"

"ہرگز نہیں۔ میری بیوی کو بھی آپ لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ آپ کے گھر اور بیوی بچوں کی بہت تعریف کر رہی تھیں وہ۔"

"اصل میں آپ لوگ اچھے ہیں۔"

"اور ریاض صاحب، کسی وقت ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف حکم کیجئے گا۔ آپ تو جانتے ہیں، پڑوسی کا کتنا حق ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔" ریاض احمد نے کہا۔ دل میں انہوں نے سوچا، سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہاں تو آدمی کو اپنی سولی آپ اٹھانی پڑتی ہے۔ سفید پوشی کا بھرم بھی کوئی چیز ہے۔

"کسی دن ہمارے ہاں تشریف لائیے نا۔" امداد صاحب نے کہا۔

"انشاء اللہ آؤں گا۔ بس مصروفیت ہی اتنی ہے۔"

ریاض احمد نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ان کی بیٹی میمونہ نے کھولا "السلام علیکم ابو۔"

"وعلیکم السلام بیٹا۔ کیسی ہو۔" ریاض صاحب مسکرائے۔

"ٹھیک ہوں ابو۔"

دونوں بیٹے بھی آگئے۔ انہوں نے سلام کیا۔ ریاض احمد کو دکھ ہوا۔ کتنے دن ہوگئے، بچوں نے نہیں پوچھا کہ ابو، میرے لیے کیا لائے ہو۔ پھر انہیں خوشی بھی ہوئی کہ بچوں کو سمجھوتا کرنا آتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں ان کی بیوی کی تربیت کا بھی دخل ہے۔

وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ میمونہ ان کے جوتے اتارنے لگی۔ اس نے موزے اتار کر باہر لے جا کر پھیلا دیے۔ اسی وقت سلمی بیگم ان کے لئے چائے لے آئیں پھر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں "تم لوگ جاؤ۔ کھیلو۔"

"دل نہیں چاہ رہا ہے امی۔" اشعر نے کہا۔

"یہ لوگ گھر سے نکلتے ہی نہیں۔ حالاں کہ اتنا اچھا محلہ ہے۔" سلمی بیگم نے شکایتاً کہا۔

"ابو، آپ بکرا کیوں نہیں لائے۔" فیاض نے باپ سے کہا۔

"یہاں تو سب کے ہاں دو دو تین تین بکرے ہیں۔ بچے انہیں نہلانے لے جاتے ہیں۔"

"بیٹے، چاہوں بھی تو نہیں لا سکتا۔ انشاء اللہ اگلے سال میں تمہیں دو بکرے لا کر دوں گا۔"

"ابو، آپ تو ہر سال قربانی کرتے ہیں۔" اشعر بولا۔

"اچھا، اب تم لوگ ابو کو تنگ نہ کرو۔ یہ سب تو میں تمہیں سمجھا چکی ہوں۔"

"سوری ابو۔" اشعر نے کہا اور ریاض احمد کے رخسار پر بوسہ دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی فیاض نے بھی ایسا ہی کیا پھر اشعر نے کہا۔

"چلو آنگن میں سائیکل چلاتے ہیں۔"

دونوں چلے گئے تو سلمی بیگم نے شوہر سے پوچھا "کیا رہا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک ہفتہ لگے گا کلیم منظور ہونے میں۔" ریاض احمد نے افسردگی سے کہا۔

"تو پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ بس چند ہی روز کی تو

بات ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر عید سر پر آگئی ہے۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے۔"

"بقر عید پر ضروری بھی نہیں ہوتے کپڑے۔" سلمی بیگم نے بے پروائی سے کہا "اور ہر بچے کے پاس کم از کم دو تین جوڑے کپڑے ایسے ہیں' جو کبھی نہیں پہنے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ عید سے پہلے کام ہو جائے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر عید میں صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ اور ایک دن پہلے سے چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ دو دن میں کام بننے کا تو امکان نہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ چھوڑیں اس بات کو۔"

رات کے کھانے پر ریاض احمد کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان کے بچے گوشت کو ترس رہے ہیں۔ فیاض بہت چھوٹا تھا۔ وہ تو حالات نہیں سمجھتا تھا۔ وہ گوشت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ سلمی بیگم اسے بہلا رہی تھیں۔ ریاض احمد کو افسوس ہوا کہ بچوں نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔

دونوں بیٹے ریاض احمد سے لپٹ کر سونے کے عادی تھے۔ سوتے وقت وہ ہمیشہ کہانی سنانے کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ اس رات ریاض احمد نے انہیں اس بادشاہ کی کہانی سنائی' جس کی سلطنت چھن گئی تھی اور وہ اپنے بچوں کو لے کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کہانی کے ذریعے انہوں نے بچوں کو سمجھایا کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے پھر اللہ مشکل وقت کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ آدمی کو نعمتوں کی قدر کرنا بھی آجاتا ہے۔

بچوں کی سمجھ میں کچھ آیا' کچھ نہیں آیا مگر ریاض احمد کو یقین تھا کہ بچوں سے کہی گئی کوئی بات رائگاں نہیں جاتی۔ جو اب سمجھ میں نہیں آئے گا' بعد میں سمجھ جائیں گے۔

بچے سو گئے مگر وہ دیر تک جاگتے رہے۔ سلمی بیگم ان کے پاس آگئیں" نیند نہیں آرہی ہے۔"

"آجائے گی۔"

"لائیں، میں آپ کے سر میں تیل لگا دوں۔"

"آپ نے اپنی پڑوسن کو خوب متاثر کیا۔" تیل لگوانے کے دوران ریاض احمد نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"امداد صاحب بتا رہے تھے...."

"ہاں، وہ صوفوں سے، ٹی وی سے، مکان کی آرائش سے بہت متاثر نظر آرہی تھیں۔"

"اللہ کیسا پردہ رکھتا ہے۔" ریاض احمد کے لہجے میں تشکر تھا۔

○

Rehan
http://www.rehanahmeds.com

اختر کو ہوش آیا تو وہ قبر میں تھا!

وہاں ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ شاہ جی نے اسے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دینے کی بات کی تھی۔ اور شاید اس پر عمل بھی کرلیا تھا۔ کرامت بابا نے جو بچوں کو سپارہ اور دینیات پڑھاتے تھے، قبر کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، یہ جگہ اس پر پوری اترتی تھی۔ بس اسے اس کی تنگی چیک کرنی تھی۔

اس نے اوپر دائیں بائیں قبر کی گنجائش چیک کرنے کی غرض سے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ایسی تکلیف تھی کہ وہ ہلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

مگر اسے یقین ہوگیا کہ وہ مرا نہیں ہے۔ کرامت بابا نے بتایا تھا کہ مرنے کے بعد آدمی ہر تکلیف سے بے نیاز ہو جاتا ہے جبکہ..... وہ شدید تکلیف میں تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں ایک بات آسکتی تھی اور وہ یہ کہ شاہ جی نے اسے مردہ سمجھ کر زمین میں گاڑ دیا ہے جب کہ درحقیقت وہ مرا نہیں تھا۔

یہ اور بڑی مصیبت تھی۔ جب تک وہ ہلنے جلنے کے قابل نہ ہوتا، قبر کے متعلق تفتیش بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ سانس لینے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ قبر میں گھٹن بالکل نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اسے الجھن ہونے لگی۔ وہ عمر بھر یوں ہی پڑا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے پوری قوت ارادی کو کام میں لاتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ جسم میں کہاں کہاں ٹیسیں اٹھی ہیں۔ بہرکیف ذرا سا ہلنے کی کوشش میں

Rehan

اس نے اپنی شامت بلالی تھی۔ اذیت کی ایسی تند و تیز لہریں اٹھی تھیں کہ اگر بے ہوشی نے اسے اپنی نرم گرم آغوش میں نہ سمیٹ لیا ہوتا تو شاید وہ مر ہی جاتا۔

○

اسلام الدین نے اختر کو فیضو کی تحویل میں دے دیا تھا۔ فیضو تو اس کا حشر دیکھ کر کانپ اٹھا تھا۔ اس کے پورے بدن پر نیل ہی نیل تھے۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں تھا' جہاں نیل نہ پڑے ہوں۔ جا بجا جلد ابھر آئی تھی اور وہ بے ہوش تھا مگر فیضو کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ زندہ کیسے ہے۔

فیضو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور لپکا ہوا نظام کے پاس آیا۔ اس نے نظام کو کوٹھری میں لے جاکر اختر کا حشر دکھایا۔ "میرا دل دکھ رہا ہے اس کے لیے" فیضو نے کہا" یار' اس نے گوشت ہی تو مانگا تھا۔ کون سی بڑی بات تھی۔"

"تجھے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟" نظام نے جل کر کہا۔

"میرے اپنے بھی بچے ہیں۔ یار وہ مجھ سے اس طرح سے گوشت کو کہیں تو خدا کی قسم" اپنا گوشت کاٹ کر دے دوں۔"

"تو اسے بھی دے دینا تھا۔"

فیضو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں" یہ تو یار' بن ماں باپ کے بچے ہیں اور ہم جو کھاتے ہیں' وہ انہی کے لئے تو آتا ہے۔"

"تو نہ کھایا کر۔" نظام کو اس کی باتوں پر غصہ آرہا تھا۔

"خیر' اب دال تو دے۔ سوتے میں ہی اس کے حلق میں انڈیل دوں گا ورنہ یہ تو بڑا ضدی ہے۔ بھوکا ہی مرجائے گا۔"

فیضو نے جیسے تیسے دال کا پانی اختر کے حلق میں انڈیلا۔ وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ اس بار وہ واپس آیا تو اس نے نظام سے کہا۔ "یار' وہ بڑی تکلیف میں ہے۔ اس کی تو سنکائی بہت ضروری ہے۔"

"اس پر شاہ جی کا عتاب ہے۔ تو اس سے ہمدردی نہ کر۔" نظام نے اسے مشورہ دیا۔

اسی لمحے اسلام الدین آگیا۔ اس نے بتایا کہ شاہ جی کا حکم ہے' اختر کے ساتھ کوئی نرمی نہ برتی جائے۔ اس کے بعد فیضو کچھ محتاط ہوگیا۔

"دیکھا تو نے۔" نظام نے فیضو سے کہا۔

"مگر یار' اسے اس طرح چھوڑا تو نہیں جاسکتا۔" فیضو سوچ میں پڑگیا پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "اس لڑکے اصغر سے اس کی بڑی دوستی ہے۔ وہ ہے بھی اچھا۔ اکڑو نہیں ہے ذرا بھی۔ اس سے مختلف ہے۔ اسے اس کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ اس کی سنکائی بھی کردے گا۔ مرہم بھی لادوں گا اسے۔"

"سوچ لے۔ شاہ جی کو پتا چل گیا تو...."

"کیسے پتا چلے گا۔ تو بس مجھے گرم پانی کر دے اور لالٹین دے دے۔ کوٹھری میں تو لائٹ بھی نہیں ہے۔"

نظام ہچکچایا مگر مان گیا۔ انسان تو وہ بھی تھا۔ اس کا دل بھی دکھ رہا تھا۔

○

اصغر بہت پریشان تھا بلکہ پریشان سے زیادہ وہ خوف زدہ تھا۔ جب سے اختر شاہ صاحب کے پاس گیا تھا' واپس نہیں آیا تھا۔ جب کہ اب رات ہوگئی تھی۔ پہلے کبھی کسی کو سزا بھی ملتی تھی تو وہ پٹ پٹا کر واپس آجاتا تھا مگر اختر کا تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

وہ کمرے میں سہما ہوا سا بیٹھا تھا فیضو نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ اصغر اس کے پاس گیا "سن اصغر' کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تو میرے ساتھ چل خاموشی سے۔"

اصغر اس کے ساتھ چل پڑا۔ فیضو نے اسے لالٹین تھمائی' خود گرم پانی کا برتن لیا اور کوٹھری کی طرف چل دیا۔ کوٹھری یتیم خانے کی عمارت کے پچھواڑے تھی۔ اس طرف کوئی جاتا بھی نہیں تھا۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہاں اندھیرا رہتا تھا۔

کوٹھری کچی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ فیضو دروازے پر رکا۔ اس نے جیب سے چابی نکالی "تو اختر کا دوست ہے نا؟"

اصغر نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"اختر کا حال دیکھ کر صبر کرنا۔ اسے تیری مدد کی ضرورت ہے۔"

اصغر نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بدترین ہی کی توقع کر رہا تھا۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدترین کیا ہو سکتا ہے۔

فیضو نے تالا کھول کر نکالا، کنڈی کھولی پھر دروازے کے پٹ دھکیلے۔

○

دوسری بار اختر کو ہوش آیا تو بھی وہ اسی قبر میں تھا مگر اس بار جسمانی اذیت ایسی تھی کہ اس نے خود کو قبر میں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہلنے جلنے کی ہر کوشش اس کی اذیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر ساکت لیٹ گیا۔

کچھ دیر گزری تو اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں۔ اسے اتنا اندازہ ہو گیا کہ اگر یہ قبر ہی ہے تو کافی کشادہ ہے۔ اس کی چھت تو اچھی خاصی بلندی پر تھی بلکہ اسے یقین ہو گیا کہ یہ قبر نہیں ہے۔ شاہ جی نے اسے کہیں قید کر دیا ہے۔

اور کچھ دیر گزری تو اپنے دائیں جانب سے اسے پہلے انسانی آوازیں سنائی دیں۔ آواز تو واضح تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ وہ آواز کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے آسمان نظر آیا۔ اگرچہ باہر بھی اندھیرا ہی تھا لیکن آسمان کو پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

پھر آسمان کی بجھی بجھی روشنی کے پیش منظر میں اسے دو ہیولے نظر آئے۔ اسی لمحے اس کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ آسمان اسے دروازہ کھلنے کی وجہ سے نظر آ رہا تھا اور دراصل وہ ایک کمرے میں تھا۔ دروازہ کھولنے والے اب کمرے میں آ رہے تھے۔

دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اب وہ پھر اندھیرے میں تھا۔ اچانک روشنی سی ہوئی۔ اندر آنے والوں میں سے کسی نے دیا سلائی جلائی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دیا سلائی کی مدد سے لالٹین روشن کر دی گئی۔

روشنی ہوئی تو اپنی تمام تر اذیت کے باوجود اختر نے سکون کی سانس لی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ روشنی کتنی بڑی نعمت ہے۔ روشنی سے پہلے تو اس کی آنکھیں

چند ھیائیں مگر پھر اس سے ہم آہنگ ہو گئیں۔

اس نے اندر آنے والوں کو پہچان لیا۔ ایک تو اصغر تھا اور دوسرا یتیم خانے کا ملازم فیضو۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ذرا ہی دیر میں اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے کوٹھری میں رکھا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اسے کال کوٹھری بنا رکھا تھا۔ جسے سزا دینا ہوتی، اسے اس الگ تھلگ اور اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔

فیضو اور اصغر اس کے پاس آگئے "تو ہوش میں آگیا؟" فیضو نے پوچھا۔

"ہاں۔" اختر نے جواب دیا۔ اپنی آواز خود اس سے نہیں پہچانی جا رہی تھی۔

دونوں اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اصغر گم صم تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ دکھی نظروں سے اختر کو تکے جا رہا تھا۔

"دیکھو اصغر، پہلے گرم پانی کی بھاپ سے اس کی سنکائی کرنی ہے۔" فیضو نے اصغر سے کہا۔ اس نے اسے کپڑے کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے دیے "پانی ٹھنڈا ہو جائے تو اس کے جسم پر ہلدی کا یہ لیپ کر دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ بعد میں بھی تجھے گرم پانی لادوں۔ نہ لاسکوں تو کپڑا لالٹین کے اوپر رکھنا اور اس سے سنکائی کرنا۔"

اصغر نے کچھ کہا نہیں۔ بس اثبات میں سرہلایا۔

"تم مجھ پر یہ مہربانی کیوں کر رہے ہو؟" اختر نے فیضو سے بمشکل پوچھا۔

فیضو چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا "دیکھ اختر، تو مجھے بددعا نہ دینا۔ مجھے بددعا سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"میری بددعا سے کسی کو ڈر نہیں لگتا ورنہ میرا یہ حشر نہ ہوتا۔" اختر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"یتیم کی بددعا بڑی خطرناک ہوتی ہے۔" فیضو نے کہا "بس تو مجھے بددعا نہ دینا۔ تو بھوکا ہو گا۔ میں کھانا لادوں تجھے؟"

"نہیں۔ میں گوشت کے سوا کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

"نہیں کھائے گا تو کمزور ہو جائے گا۔ اتنی تکلیف تو ویسے ہی ہے ...."

"میں نے کہہ دیا نا۔"

"اچھا ..... میں تجھے گوشت لا دیتا ہوں۔"

"چوری کر کے لاؤ گے۔ مجھے نہیں چاہیے۔" اس وقت اختر پوری طرح بچہ بن گیا تھا۔ اس پر ضد سوار تھی۔

"ضد نہ کر اختر۔ مان جا۔" اصغر نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اچھا' میں ہوٹل سے لا دوں گا ..... اپنے پیسوں سے۔"

"ٹھیک ہے۔"

فیضو اٹھ کھڑا ہوا "میں ایک گھنٹے میں آؤں گا۔ کوئی چادر بھی لے آؤں گا تمہارے لیے۔" وہ چلا گیا اور باہر سے دروازہ بند کر گیا۔

"دیکھ 'گوشت کی ضد میں تو نے اپنا کیا حال کرلیا ہے۔" اصغر نے اختر سے کہا۔

"لیکچر نہ دے۔ میرے لیے کچھ کر۔" اختر چڑ کر بولا۔

اصغر خاموشی سے فیضو کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سنکائی کی تیاری کرنے لگا مگر جیسے ہی اصغر نے گرم کپڑا اختر کے مضروب بدن پر رکھا' اختر کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی .... طویل چیخ! پھر وہ چیختا چلا گیا۔

کہتے ہیں' یتیم کی فریاد عرش کو بھی ہلا دیتی ہے!

○

کھانے کے بعد چندو کو لے کر ٹہلنے کے لئے نکلنا بھائی جان کا معمول تھا۔ وہ خاصی لمبی چہل قدمی کرتے تھے۔ میدان تک کا فاصلہ بھی اچھا خاصا تھا مگر وہ میدان کا ایک چکر بھی لگاتے تھے۔ اس دوران چندو کبھی ان کے آگے آگے بھاگتا اور کبھی پیچھے رہ جاتا تو وہ اسے پکارتے۔ راستے میں جو کوئی بھی ملتا' پہلے وہ بھائی جان کو سلام کرتا پھر چندو کا سر تھپتھپا کر چندو کی مزاج پرسی کرتا "کیسے ہو چندو میاں۔" جیسے باجی جگت باجی تھیں' ویسے ہی ان کے شوہر بھی جگت بھائی جان تھے۔

ٹہل کر گھر واپس آئے تو وہ کمرے میں چلے گئے اور چندو صحن کی دیوار کے ساتھ بنے ٹین کے اس شیڈ میں بیٹھ گیا' جو اس کی اسٹڈی تھا۔ یہاں وہ صرف غور و فکر اور جگالی کی غرض سے بیٹھتا تھا۔ ورنہ تو پورے گھر میں دندناتا اس کا معمول تھا لیکن رات کی چہل قدمی کے بعد وہ لازمی طور پر یہاں بیٹھتا تھا۔ شاید دن بھر کے معاملات پر غور کرنے کے لئے۔

بھائی جان نے کمرے میں داخل ہوتے ہی باجی سے کہا "اور بھئی' اب چائے پلا دو جلدی سے۔"

باجی چائے کا پانی پہلے ہی چولھے پر رکھ چکی تھیں۔ دو منٹ میں وہ چائے لے آئیں' دونوں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

"آج پتا ہے' چندو نے کتنی بری حرکت کی۔" باجی نے کہا اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا "اتنی شرمندگی ہوئی مجھے۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟" بھائی جان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے اسے سخت سزا دی۔ اس کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر

دیا۔ پورے ایک گھنٹے کھڑا رہا بے چارہ۔"

"زیادتی کی۔" بھائی جان نے تاسف سے کہا۔

"یہ سب تربیت کا حصہ ہوتا ہے۔" باجی فوراً" اسکول ٹیچر بن گئیں" بچے کو ٹوکنا ضروری ہے۔ خواہ وہ سمجھ دار نہ ہو۔ اسے لاشعوری طور پر برے اور بھلے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ بچے کو بے لگام تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"بھئی وہ تو جانور ہے۔ نا سمجھ ہے۔ صرف محبت کیا کرو اس سے۔"

"آپ اسے جانور نہ کہا کریں۔" باجی نے چڑ کر کہا "وہ بیٹا ہے ہمارا۔"

"ہے۔ مگر جانور تو جانور ہی رہتا ہے۔"

"نہیں رہتا۔ انسان کی سچی محبت ملے تو آدمی کا بچہ بن جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں آپ، کتنا سمجھ دار ہے۔ ہر بات سمجھتا اور مانتا ہے۔ جیسا کہو، ویسا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سے اور مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ باقاعدہ پیار کرتا ہے۔"

بھائی جان نے اداس نظروں سے بیوی کو دیکھا "کب تک خود کو بہلاؤ گی شمسہ بیگم۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ میرے لیے تو وہ اس بیٹے کی طرح ہے، جسے میں نے نو ماہ پیٹ میں رکھا ہو اور اذیتیں سہہ کر جنم دیا ہو اور وہ بھی مجھے ماں ہی سمجھتا ہے۔ اب دیکھ لیجئے گا۔ آئندہ وہ اس طرح باہر کبھی منہ نہیں مارے گا۔"

"اب آپ اس پر شرط بھی لگائیں گی۔" بھائی جان نے آہ بھر کے کہا۔

"بالکل لگا سکتی ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" بھائی جان نے کہا "آئندہ جس دن بھی وہ کہیں منہ مارے، آپ مجھے قیمہ پراٹھے پکا کر کھلائیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ شرط تو دو طرفہ ہوتی ہے۔" باجی نے کہا۔

"یہ شرط بھی دو طرفہ ہے۔" بھائی جان مسکرائے "وہ زندگی بھر باہر کہیں منہ نہیں مارے گا تو آپ شرط جیت جائیں گی اور جو آپ مانگیں گی، وہ میں دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" آپا نے کہا لیکن کہتے ہی چونکیں "مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ یہ ساری زندگی کی شرط! مجھے تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"بھئی آپ نے چیلنج ہی یہ کیا ہے۔"

"نہیں جی، کوئی وقت کی حد بھی تو دیجئے۔"

بھائی جان کچھ دیر سوچنے کی اداکاری کرتے رہے پھر بولے۔ "جانور کا .... میرا مطلب ہے، چندو کا معاملہ ہے۔ آزمائشی وقت تو زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ اچھا، ایک سال ٹھیک رہے گا؟"

"جی نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہے۔"

"چلیں .... ساڑھے گیارہ مہینے سہی۔" بھائی جان نے خاصی سوچ بچار کے بعد کہا۔

"یہ کیا۔ کسی دکان پر بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں کیا۔" باجی چڑ گئیں۔

"بھاؤ تاؤ تو آپ کرتی ہیں۔ میں تو آپ کو احساس دلا رہا ہوں کہ دکان دار کیسے عاجز آجاتے ہوں گے۔"

"بس ایک مہینہ کافی ہے۔" باجی نے فیصلہ سنا دیا۔

"نہیں بھئی۔ یہ تو بہت کم ہے۔"

دو مہینے پر اتفاق ہوگیا "چلیں ..... اب سو جائیں۔" باجی نے کہا۔

بھائی جان دانت برش کرنے کے لئے باتھ روم میں چلے گئے۔ باجی نے باہر کا رخ کیا۔ شیڈ میں بلب جل رہا تھا اور چندو بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا ہے "چندو بیٹا، آجا اب سوئیں گے۔ رات ہو رہی ہے۔" باجی نے اسے پکارا۔

چندو اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں بلکہ شاید اس نے ان کی آواز بھی نہیں سنی۔

"آجایئے ..... سونا نہیں ہے۔"

اس بار چندو نے سر اٹھا کر بڑی بے نیازی سے انہیں دیکھا۔ اس بار بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"ٹھیک ہے۔ میں لائٹ بند کر رہی ہوں۔ آج تو اکیلے ہی سونا۔ میں دروازہ بھی بند کر رہی ہوں کمرے کا۔"

اب کے چندو بڑی پھرتی سے اٹھا۔ وہ بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا اور ان کی

ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا۔ باجی بیٹھ گئیں "تو ناراض ہے مجھ سے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ چندو نے باقاعدہ اوپر نیچے سر ہلایا۔

"پگلا کہیں کا۔" باجی نے بڑے پیار سے کہا "بچے بدتمیزی کرتے ہیں تو ماں باپ کی بے عزتی ہوتی ہے اس لئے انہیں سزا دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں ان کی بہتری ہوتی ہے۔ اب تو آئندہ ایسی بدتمیزی کبھی نہ کرنا۔"

چندو نے اس بار سر کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت دی۔ باجی نے اس کا منہ اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ انہوں نے اسے پیار کیا۔ "روتا ہے ..... امی سے ناراض ہوتا ہے۔ بے وقوف کہیں کا۔ چل کمرے میں، آج میں تجھے بہت اچھی لوری سناؤں گی۔"

اس بار چندو نے ان کے رخسار پر پیار کیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ باجی نے آنگن والے دروازے کی کنڈی چیک کی، پھر لائٹ آف کردی۔ وہ کمرے میں آئیں تو چندو مسہری پر اپنی مخصوص جگہ پر لیٹ چکا تھا۔ وہ بھائی جان اور باجی کے درمیان سوتا تھا۔

اسی وقت بھائی جان باتھ روم سے نکل آئے "آگیا آپ کا لاڈلا۔"

باجی نے کمرے کی لائٹ آف کی اور زیرو کا بلب روشن کر دیا۔ پھر وہ اپنی جگہ آلیٹیں۔ چندو نے ان کے لیٹتے ہی بڑے لاڈ سے اپنا ایک ہاتھ ان کی گردن میں حمائل کردیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اپنے پہلو میں سمیٹ کر رکھا تھا تاکہ ساتھ سونے والے ماں باپ میں سے کسی کو بھی پریشانی نہ ہو۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر چندو مضطرب ہو کر کسمسانے لگا۔ باجی اس کا سبب جانتی تھیں مگر دانستہ نظر انداز کرتی رہیں۔ بالآخر چندو سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑی باریک سی ..... میں ..... کی آواز نکالی۔ وہ محض آواز نہیں تھی۔ اس میں لہجہ بھی تھا۔ وہ التجا کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے چندو؟ نیند نہیں آرہی ہے؟"

چندو نے اس بار موٹی سی ..... میں ..... نکالی۔ اس میں شکایت تھی۔ پھر اس کے بعد باریک سی میں .....

"لوری سنے گا۔"

بستر ہل کر رہ گیا۔ چندو نے سر ہلانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ نے اس کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔" بھائی جان نیند میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائے۔

"آپ سو جایئے۔"

بھائی جان نے جواب نہیں دیا۔ وہ سچ مچ سو چکے تھے۔

باجی نے لوری شروع کر دی۔ چندا کے ہنڈولے میں' اڑن کھٹولے میں۔ امی کا دلارا' ابو جی کا پیارا سوئے۔ نندیا جھلائے تجھے جھولے .... وہ ایسے جذبے سے گا رہی تھیں کہ خود اپنی آواز انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چندو کا ہاتھ ان کے سینے پر تھا اور اس کی آنکھیں مندتی جا رہی تھیں۔

باجی کو خود بھی احساس نہیں ہوا کہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لوری گاتی چلی گئیں۔ اندر ماما کا ایک سمندر تھا' جو ان کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک بے خودی سی طاری تھی ان پر۔

جب وہ اس کیفیت سے نکلیں تو سب سے پہلے ان کی نظر چندو پر پڑی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب بھی ان کے سینے پر تھا اور اس کے خوب صورت چہرے پر معصومیت تھی۔ باجی کو اچانک ہی ایک خیال آگیا۔ شوہر کی بات ان کے دل میں چبھ رہی تھی۔

"سنتے ہیں .... اجی سنتے ہیں۔" انہوں نے ہلے بغیر شوہر کو پکارا۔ اصولاً" انہیں اٹھ کر شوہر کو جھنجوڑ دینا چاہیے تھا مگر وہ ایسی پوزیشن میں تھیں کہ اٹھتیں تو چندو کی نیند خراب ہوتی۔ چناں چہ وہ پکارتی رہیں .... سنئے .... اجی سنتے ہیں .... ہر بار ان کی آواز پہلے سے بلند ہو جاتی۔

بڑی مشکل سے بھائی جان کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کیا کھلی' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے "کیا ہوا .... کیا ہوا شمسہ بیگم؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "خیر تو ہے؟"

"ہاں .... کچھ دکھانا چاہتی ہوں آپ کو۔"

"کہاں .... کدھر .... کیا ہے؟" بھائی جان نیند سے اٹھے تھے اور گھبرائے ہوئے

تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے ہیں اور باجی نے ان کی آہٹ سن لی تھی۔

"ارے ادھر دیکھیے ..... میرے چندو کو۔"

"کک ..... کیا ہوا ..... زندہ تو ہے؟"

"کیا واہی تباہی کہے جا رہے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں۔"

بھائی جان نے زور زور سے آنکھیں ملیں اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چندو کو دیکھا۔ بظاہر تو وہ خیریت سے تھا "دیکھ تو رہا ہوں۔ صاف نظر آرہا ہے مگر ہوا کیا ہے اسے۔ خیریت تو ہے۔"

"خیریت ہے۔ ذرا اسے دیکھ کر یہ تو بتائیے کہ کیا جانور ایسے ہوتے ہیں .... ایسے سوتے ہیں۔"

بھائی جان کو ان کی بات سمجھنے میں ایک منٹ لگا اور جب بات سمجھ میں آئی تو وہ بھنا گئے "یہ بتانے کے لئے میری نیند خراب کی ہے آپ نے؟"

"آپ ہی تو اسے جانور کہے جا رہے تھے۔" باجی نے شکایت کی۔

"وہ تو میں مذاق کر رہا تھا ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ نہ کرتا ہوتا تو یوں سوتا بھلا اس کے ساتھ۔"

دلیل سچی اور عملی تھی۔ باجی کے دل پر اثر کر گئی پھر بھی شک کا کانٹا انہیں بے چین کر رہا تھا۔

بھائی جان بڑی محبت سے چندو کو دیکھ رہے تھے "اسے میں جانور سمجھوں گا" انہوں نے سوئے ہوئے چندو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ارے یہ تو میرا بیٹا ہے ..... بیٹا۔"

یہ کہہ کر وہ لیٹے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ باجی کے وجود میں عجیب سی طمانیت تیر گئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے بڑی سچائی سے زیر لب کہا "اے اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا چندو بہت اچھا بیٹا ہے۔" چند لمحوں کے اندر وہ سو بھی گئیں۔

○

سنکائی تو اختر برداشت نہیں کر سکا تھا۔ چناں چہ اصغر نے اس کے بجائے اس کی

چوٹوں پر ہلدی کا لیپ پہلے لگا دیا۔ اس سے بہت بڑا فرق پڑا۔ ہلدی نے جیسے جادو کے زور پر پورا درد کھینچ لیا۔ تکلیف اب بھی تھی مگر پہلے کے مقابلے میں تو اسے آرام ہی کہا جاسکتا تھا۔

نجانے کتنی دیر کے بعد فیضو آیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ ایک دری بھی تھی' جو اس نے کوٹھری کے لیپے ہوئے کچے فرش پر بچھا دی۔ "میری بیوی کہہ رہی تھی کہ پہلے ہلدی لگانی چاہیے۔ اس کے بعد جہاں درد کا احساس ہو اور سوجن بھی ہو' وہاں سنکائی کرنی چاہیے۔"

"سنکائی تو اس سے برداشت ہی نہیں ہو رہی تھی فیضو بھائی۔" اصغر نے اسے بتایا "پھر میں نے ہلدی کا لیپ لگا دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔ میری بیوی تو مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اب میں کیا جانوں ان معاملات کو۔" فیضو اختر کی طرف مڑا "اب کیا حال ہے تیرا؟"

اختر نے شکر گزاری سے اسے دیکھا "تکلیف بہت کم ہوگئی ہے فیضو بھائی۔"

"چل اٹھ کر بیٹھ۔ کھانا کھالے۔"

"مجھے دال نہیں کھانی۔" اختر کی اکڑ اب بھی قائم تھی۔

"اٹھ تو سہی۔ دیکھ میں کیا لایا ہوں تیرے لیے۔"

فیضو نے اخبار کو دسترخوان کی طرح بچھا دیا۔ ایک بڑی پلیٹ میں بھنا ہوا قیمہ تھا' جس سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اختر اٹھ تو بیٹھا مگر اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بظاہر تو درد کھنچ چکا تھا مگر درحقیقت وہ سویا ہوا تھا اور اس کے جوڑ دکھ رہے تھے۔ بہرکیف وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے بے تابی سے چپاتی سے نوالہ توڑا مگر نوالہ قیمے کی طرف بڑھاتے بڑھاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔

"کیا ہوا؟" فیضو نے پوچھا۔

"دل نہیں چاہتا فیضو بھائی۔ اب میں نے سوچا تھا کہ یتیم خانے کا کچھ بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"ابے یہ یتیم خانے کا مال نہیں ہے۔ یہ میں لایا ہوں۔" فیضو نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

اصغر کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ قیمے پر ٹوٹ پڑے مگر وہ ضبط کرتا رہا۔ اختر نے پہلا نوالہ لیا "واہ فیضو بھائی' کون سے ہوٹل کا ہے؟" اس نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہوٹل کا نہیں' گھر کا کھانا ہے بیٹے۔ میں قیمہ لے گیا تھا۔ تیری بھابی نے پکایا ہے۔"

"مزہ آگیا۔" اختر نے کہا۔ پوری روٹی کھانے کے بعد پیٹ کچھ بوجھل ہوا تو اسے خود سے ہٹ کر بھی کچھ دیکھنے کی توفیق ہوئی۔ اسے اصغر کا خیال آیا۔ وہ بھی تو گوشت کے لئے ترس رہا تھا "اصغر' تو بھی تو کھا۔" اس نے اصغر کو دعوت دی۔

"نہیں یار' تو کھا۔ میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔ پیٹ بھرا ہوا ہے۔" اصغر نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

"کھا لے یار۔ تو بھی تو گوشت کو ترس رہا تھا۔"

"مگر یار' ایک بار پیٹ بھر کر کھانے کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کھایا جاتا۔" اصغر کا خیال تھا کہ دن بھر کے بھوکے اختر کے لئے ہی یہ کھانا کم ہے پھر وہ کیوں اس میں حصہ بٹائے۔

فیضو جو باہر چلا گیا تھا' جگ میں پانی اور گلاس لے آیا۔ اتنی دیر میں اختر پورا کھانا چٹ کر چکا تھا۔ اس نے پانی پیا اور فوراً" ہی دری پر لیٹ گیا۔

"ابھی مت لیٹ۔ پہلے یہ پی لے۔" فیضو نے اس کی طرف ایک بڑی بوتل بڑھائی۔

"یہ کیا ہے فیضو بھائی۔"

"دودھ ہے۔ اس میں ہلدی ملائی ہے۔ میری بیوی کہتی تھی' یہ سارا درد کھینچ لے گا۔ جلدی سے پی لے۔"

اختر اب اٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر فیضو کے اصرار پر اس نے وہ دودھ پی لیا۔ دودھ پی کر وہ جو لیٹا تو اسے فوراً" ہی نیند آگئی۔ "میں اب چلتا ہوں۔" فیضو نے اصغر سے کہا "تو اس کے پاس رہ اور اس کا خیال رکھ۔ کہیں درد ہو تو سنکائی کر دینا۔"

"تم دروازہ باہر سے بند کر جاؤ گے؟" اس بار اصغر خوف زدہ ہوگیا۔

"صرف بند کر کے نہیں جاؤں گا' تالا بھی لگاؤں گا۔"

"فیضو بھائی، ہمیں ڈر لگے گا۔" اصغر نے کہا پھر اسے ایک اور بہانہ بھی مل گیا "اور جو مجھے یا اختر کو پیشاب لگا تو؟"

"میں کچھ نہیں کرسکتا۔" فیضو نے کہا "پتا ہے، شاہ صاحب نے کہلوا دیا تھا کہ اختر کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرنی۔ ان کا حکم تھا کہ اسے اس کوٹھری میں اکیلا ڈال دیا جائے پھر بھی میں جو کرسکتا تھا، میں نے اس سے زیادہ کیا ہے۔ اب میں دروازہ کھلا چھوڑ دوں اور تم لوگ بھاگ جاؤ ....." یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ "..... تو میری تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ دیں گے نا۔ اس لئے میں دروازہ بھی بند کروں گا اور تالا بھی لگاؤں گا۔ اب کوٹھری میں ایک کدال پڑی ہے، اس کی مدد سے تم دیوار توڑ کر نکل جاؤ تو اور بات ہے۔ نہ وہ کدال میں نے یہاں رکھی، نہ میں اس کا ذمے دار ہوں۔ بلکہ میں کہہ دوں گا کہ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ سمجھے کچھ؟"

نو سالہ اصغر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر بھی اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"یہ ہلدی درد تو کھینچ لے گی مگر اس کے جسم پر زخم بھی ہیں۔ ان پر مرہم لگاتے رہنا۔ ہلدی بھی لگا دینا اور سنکائی بھی کرنا۔ ابھی کل تک تو یہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا مگر مشکل سے۔ تو اس کا خیال رکھنا۔ تیری یہاں موجودگی کا میرے اور نظام کے سوا کسی کو پتا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے فیضو بھائی!"

"اب میں چلتا ہوں۔" فیضو نے کہا۔

فیضو چلا گیا تو اصغر نے جاکر دروازے کی آزمائش کی۔ دروازہ واقعی بند تھا پھر اس نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں اسے وہ کدال نظر آگئی، جس کا تذکرہ فیضو نے کیا تھا۔ اس نے جاکر کدال کو اٹھایا اور ہاتھوں میں تول کر دیکھا۔ کدال خاصی بھاری تھی۔ اس نے آزمائش کے طور پر کدال زمین پر ماری۔ اسے خوشی ہوئی کہ بھاری ہونے کے باوجود وہ کدال استعمال کرسکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ فیضو نے کدال سے دیوار توڑ کر نکلنے کا امکان بھی ظاہر کیا تھا۔ چناں چہ اس نے کدال کی دھار کو کچی دیوار پر بھی آزمایا۔ اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا تھا۔ یعنی دیوار توڑی جاسکتی تھی۔

اصغر نے کدال کو ایک طرف رکھا اور اختر کے قریب آ بیٹھا۔ وہ فیضو کی باتوں

پر غور کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ایک بات تو سمجھ میں آئی تھی اور وہ یہ کہ یہاں سے بھاگا جاسکتا ہے مگر بھاگ کر کہاں جائیں گے وہ؟ دنیا میں ان کا کوئی ہے ہی نہیں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔ کہاں پناہ ملے گی انہیں؟ اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ضرورت بھی کیا ہے بھاگنے کی۔

وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا مگر یقینی طور پر رات کافی ہو چکی تھی۔ اسے نیند آرہی تھی۔ دری خاصی بڑی تھی۔ وہ وہیں پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اختر کا درد تو بہت کم ہو گیا تھا مگر جس طرح کی اسے مار لگی تھی، اس کے نتیجے میں جسم کے بیش تر حصے بری طرح دکھ رہے تھے۔ سوتے میں بے خیالی میں جو اس نے پہلو بدلا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کی چیخ سن کر اصغر جاگا۔ اس بار اس نے زخموں پر مرہم بھی لگایا اور بند چوٹوں پر بھی ہلدی کا لیپ کیا۔

دونوں بچوں کی رات اسی طرح گزری۔ جانے کتنی بار اختر ایسے ہی چیخ مار کر جاگا ..... کبھی تکلیف کی وجہ سے اور کبھی کسی ڈراؤنے خواب کی وجہ سے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر کو تقریباً" پوری رات جاگنا پڑا۔

"صرف گوشت کی ضد میں تو نے اپنا یہ حال کرالیا۔" ایک بار اصغر نے اسے ملامت کی "کیا پتلی دال کھانے سے مرجاتا۔ پتلی دال کھا کر بھی زندہ رہا جاسکتا ہے۔"

"عمر بھر پتلی دال کھا کر ہی تو زندہ رہا ہوں۔" اختر نے جواب دیا "مگر اب سوچتا ہوں، کیا یہ زندہ رہنا ہے کہ آدمی اپنا حق کبھی نہ مانگ سکے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ حق مانگتے ہوئے مرجائے۔" چھوٹا سا بچہ اپنی عمر سے بہت بڑی بات کر رہا تھا۔ یا تو وہ اصل مفہوم سے بے خبر تھا اور محض لفظ ادا کر رہا تھا یا پھر زندگی نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

"کیا حاصل ہوا تجھے؟"

"یار اصغر، میں اس موٹے پیٹ والے شاہ جی سے صرف ایک ..... صرف ایک بوٹی مانگ رہا تھا۔" اختر رو دیا "وہ مجھے گوشت میں تلوا سکتا تھا مگر اس نے مجھے ایک

بوٹی بھی نہیں دی۔ پتا ہے' کیوں نہیں دی۔"

اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس لیے نہیں دی کہ کہیں مجھے اپنا حق مانگنے کی عادت نہ پڑ جائے اور جانتا ہے' اس نے مجھے اتنا کیوں مارا؟"

"کیوں مارا؟"

"اس لیے کہ میں دوسروں کو ان کے حق کے بارے میں نہ بتاؤں۔ انہیں یہ نہ بتاؤں کہ جو کچھ ان کے لئے آتا ہے' وہ دوسرے کھا جاتے ہیں اور اس لئے کہ میں نے غصے میں اس سے کہا تھا کہ میں دینے والوں کو بھی بتا دوں گا۔"

"مگر اس سب کے بعد تجھے تو کچھ بھی نہیں ملا۔" اصغر نے تاسف سے کہا۔

"مجھے بہت ڈر لگا۔ اب بھی لگ رہا ہے۔ پتا ہے' اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مار کر یتیم خانے کے صحن میں گاڑ دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" اختر کے لہجے میں خوف تھا "مجھے اس وقت بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

اصغر اس سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا "شاہ جی ایسا کر بھی سکتا ہے۔"

"ہاں' کر سکتا ہے مگر اصغر اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو اصغر اس کی مخالفت کرتا مگر اس وقت تو اس پر شاہ جی کا خوف طاری تھا "مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"دیکھیں گے۔ دنیا بہت بڑی ہے اور ہم باہر جا کر خوب جی بھر کر گوشت کھائیں گے۔"

یہی باتیں کرتے کرتے صبح ہو گئی۔

○

اس صبح ریاض احمد کی آنکھ سویرے ہی کھل گئی۔ رات بھی وہ ٹھیک طرح سے سوئے نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ تھکن اور بڑھ گئی تھی، جسے دن بھر سمیٹنے کے بعد وہ بستر تک لے گئے تھے۔ اب جاگے تو بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے لیکن جب سے وہ لوگ اس گھر میں آئے تھے، سلمی بیگم انہیں سویرے اٹھنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

"اتنی تھکن ہوتی ہے۔ آپ سو تو اچھی طرح لیا کریں۔" وہ کہتیں۔ "اور آپ کو کون سا جلدی جانا ہوتا ہے۔" بات درست تھی۔ لہٰذا ریاض احمد لیٹے رہتے۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی جلدی اٹھ گئے۔ دونوں بڑے بچے اسکول جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چھوٹا فیاض ہنگامہ کر رہا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ سلمی بیگم تینوں کو کیسے نمٹاتی ہیں۔

سلمی بیگم کمرے میں آئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور باتھ روم جانے کا ارادہ کر رہے تھے؟ ارے ..... آپ اتنی جلدی اٹھ گئے؟"

"ہاں، آنکھ کھل گئی۔ رات نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔"

سلمی بیگم نے ان کا ہاتھ چھو کر دیکھا اور تشویش سے بولیں۔ "آپ کو تو حرارت ہے۔"

"ہاں، جسم بھی ٹوٹ رہا ہے۔"

"آپ باتھ روم سے فارغ ہو کر لیٹ جائیں ...."

"میں سوچ رہا ہوں کہ ناشتا بچوں کے ساتھ کروں۔"

"ارے نہیں۔ آپ لیٹیں۔ میں آپ کو یہیں ناشتا دے دوں گی۔ وہاں تو بڑا

ہنگامہ ہے۔ سر میں درد ہو جائے گا آپ کے۔"

ریاض احمد نے بہت سے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا نہیں کیا تھا۔ بہت دل چاہ رہا تھا ان کا لیکن بیگم کے لہجے میں ایسا اصرار تھا کہ وہ اسے رد نہ کر سکے۔ باتھ روم سے باہر آکر وہ بستر پر بیٹھ گئے۔ ڈائننگ روم کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"جلدی کرو بیٹے ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔" سلمی بیگم کہہ رہی تھیں۔

"امی، مجھ سے خالی ڈبل روٹی نہیں کھائی جاتی۔" اشعر نے تنک کر کہا۔

"تم ٹھیک طرح سے کھاتے نہیں ہو نا، اس لیے۔ چائے میں بھگو کر کھاؤ۔"

"امی کتنے دن ہو گئے، مکھن نہیں کھایا۔"

"تھوڑے دن کی بات ہے پھر جی بھر کے مکھن کھلاؤں گی تمہیں۔"

"اور پنیر بھی۔" یہ فیاض کی آواز تھی۔

"ہاں، پنیر بھی۔"

"اور جام اور جیلی بھی .... اور انڈا بھی۔"

"ہاں ہاں، سب کچھ ملے گا انشاء اللہ۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ تھوڑے دن کب پورے ہوں گے۔" اشعر بولا۔

"جب اللہ کی مرضی ہوگی، پورے ہو جائیں گے۔"

"امی، پہلے ابو روز یہ سب چیزیں لے کر آتے تھے۔ اب کچھ نہیں لاتے۔ اب تو ہمیں شہد اور بادام بھی نہیں ملتا۔" فیاض نے شکایت کی۔

"سب کچھ اللہ میاں دیتے ہیں بیٹے۔ آدمی کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ پھر اللہ میاں کبھی کبھی محروم کر دیتے ہیں تاکہ آدمی کو ان چیزوں کی اہمیت کا پتا چلے اور یہ بھی سمجھ میں آئے کہ سب کچھ اللہ میاں دیتے ہیں۔"

"ہماری تو سمجھ میں آگیا امی۔"

"تو اب تمہیں سب کچھ مل جائے گا انشاء اللہ۔"

کرسیاں کھسکانے کی آواز آئی پھر سلمی بیگم نے کہا "اور لو نا۔"

"نہیں امی۔ مجھ سے زیادہ نہیں کھایا جاتا۔" یہ اشعر تھا "اور امی، آج گوشت

ضرور پکائیے گا۔"

"آج میں تمہارے لیے گوشت سے بھی اچھی چیز پکاؤں گی۔"

"آپ روز یہی کہتی ہیں۔ گوشت نہیں پکاتیں۔"

"اچھا بیٹے' اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ امی۔"

اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھے ریاض احمد کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ بچوں کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ان پر گھونسا بن کر لگا تھا۔ اتنے دنوں میں انہوں نے اس زاویے سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ بچوں کی محرومی تو بہت بڑی ہے۔ انہیں کیا پتا کہ حالات بدلنا کسے کہتے ہیں اور برا وقت کیا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں بیوی پر ٹوٹ کے پیار آیا۔ واقعی اچھی بیوی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ سلمی بیگم نے انہیں اس گھر میں بچوں کے ساتھ ناشتا کیوں نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ انہیں اس کرب سے بچاتی رہیں .... اور خود سہتی رہیں سب کچھ اور وہ بچوں کو کتنی اچھی طرح ہینڈل کر رہی تھیں۔

مگر پھر ان کا دل کٹنے لگا۔ بچے ناشتے میں خالی ڈبل روٹی کھا رہے تھے۔ وہ ان کے حلق میں پھنس رہی ہوگی مگر فوراً" ہی انہیں یہ خیال آیا کہ یہ ڈبل روٹی کہاں سے آئی۔ انہوں نے تو ایک ماہ سے سلمی بیگم کو پیسے ہی نہیں دیے تھے۔ آخری بار جو پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تھے' اس سے انہوں نے گھر میں راشن ڈلوا لیا تھا اور اپنے کرائے کے لئے پیسے سنبھال کر رکھ لیے تھے اور اس کے بعد انہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ممکن ہے' راشن ختم ہوگیا ہو۔ وہ باہر کی پریشانیوں میں گم ہوگئے۔ گھر کا خیال ہی نہیں رہا انہیں۔ سلمی بیگم نجانے کیسے گھر چلا رہی ہیں۔

سلمی بیگم لان کے لئے چائے اور گھی میں سنکے ہوئے سلائس لے کر آئیں۔ ریاض احمد نے دیکھا کہ گھی برائے نام ہی استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے بے دلی سے ناشتا کیا۔ اور بیوی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے رہے "بچے بہت فرسٹریٹ ہوگئے ہیں۔" انہوں نے اچانک کہا۔

"جی نہیں۔" سلمی بیگم مسکرائیں "خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو

اتنے سمجھ دار بچے عطا فرمائے۔ اتنی سی عمر میں حالات سے سمجھوتا کرنا آسان نہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" ریاض احمد نے بے حد خلوص سے کہا "مگر آج مجھے شرمندگی بہت ہوئی ہے۔ میں اپنی نظروں سے گر گیا ہوں۔"

سلمی بیگم نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "ایسے نہ سوچیں۔ وقت اچھا ہو یا برا' آپ تو ان کے مہربان باپ ہیں اور سچ' آپ کے بچے تو بہت پیارے ہیں۔ کب سے اسکول جاتے وقت میں نے انہیں پیسے نہیں دیے۔ ایک دن ناشتا بھی نہیں کر کے گئے۔ دیر سے سو کر اٹھے تھے ہم لوگ۔" انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "اس روز میں بریک میں ان کے لئے لنچ باکس لے کر گئی تو جانتے ہیں' کیا دیکھا میں نے؟"

ریاض احمد نم آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

"سب بچے ادھر ادھر چیزیں خریدتے اور کھاتے پھر رہے تھے۔ اشعر اور میمونہ بے فکروں کی طرح سب سے الگ تھلگ پکڑم پکڑی کھیل رہے تھے۔ انہیں گردوپیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔ مجھے اس وقت ان پر ایسا پیار آیا کہ کیا بتاؤں۔ سچ .... بہت اچھے بچے ہیں۔"

"اور آپ بہت اچھی بیوی ہیں سلمی بیگم!" ریاض احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا "یہ بتائیں کہ میں نے کب سے آپ کو پیسے نہیں دیے۔ آپ کیسے کام چلا رہی ہیں؟"

"اسے چھوڑیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ مسکرائیں "لیکن آپ میرے مقروض ہو رہے ہیں۔"

"وہ تو میں ہوں اور رہوں گا۔" ریاض احمد نے کہا "مگر ایک بات کہوں۔"

"کہئے۔"

"آج آپ مجھے کچھ نہ دیں۔ گوشت پکالیں۔ بچے ہڑک گئے ہیں گوشت کو۔"

"میں یہ کر دیتی لیکن سوچیں تو' صرف کل کا دن بیچ میں ہے۔ پرسوں بقرعید ہے۔ انشاء اللہ خوب اچھی طرح گوشت کھالیں گے۔ آج میں انہیں بہلالوں گی۔ سوچا ہے' بیسن کی کھنڈویاں پکالوں گی بہت اچھی طرح۔ آپ بے فکر رہیں۔"

ریاض احمد ممنونیت سے انہیں دیکھتے رہے۔

○

باجی صبح ہی اٹھیں۔ انہوں نے جلدی جلدی شوہر کے لئے ناشتا تیار کیا۔ انہیں جلدی نکلنا ہوتا تھا۔ پک اپ پوائنٹ سے کمپنی کی گاڑی میں بیٹھے تو دفتر پہنچتے۔ لیٹ ہو جاتے اور گاڑی نکل جاتی تو بڑی دشواری ہوتی۔ کمپنی کے دفاتر شہر سے اچھا خاصا باہر تھے۔ اپنے طور پر وہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ کم از کم دو تین گھنٹے لگتے۔

وہ دفتر چلے گئے تو چندو کے معمولات کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے باجی نے چندو کو خوشبو دار صابن سے رگڑ رگڑ کر نہلایا۔ تولیے سے اس کا جسم اچھی طرح خشک کرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اسے سویٹر پہنایا۔ چندو کے پاس کئی سویٹر تھے۔ وہ سب باجی نے خود بنے تھے۔ نہلانے کے بعد چندو کو سویٹر پہنانا بہت ضروری تھا۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو اسے چھینکیں آنے لگتیں۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد باجی ڈرائی فروٹ کا ڈبا نکال لائیں۔ انہوں نے معمول کے مطابق سات بادام، سات پستے اور اخروٹ کی گری کے تین دانے نکال کر پلیٹ میں رکھے۔ یہ بھی ان کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ چندو نے وہ فوراً ہی ہڑپ نہیں کیے بلکہ سکون سے کھائے۔ شروع میں وہ اسے ٹوکتی تھیں "جانوروں کی طرح ایک دم سے نہیں کھا جاتے۔ خوب چبا چبا کر کھایا کر۔"

چندو نے تمام چیزیں خوب چبا چبا کر کھائیں۔ مزید کا تقاضا تو وہ ہمیشہ کرتا تھا لیکن گزشتہ روز کا بے حساب ڈرائی فروٹ کھانے کا تجربہ اسے یاد تھا۔ باجی ڈبا لے کر اٹھنے لگیں تو اس نے دانتوں میں ان کا دامن دبا کر انہیں التجائی نظروں سے دیکھا۔

باجی نے معمول کے مطابق اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے اسے غریب والدین کے حوالے سے سمجھایا۔ پھر انہوں نے بادام اور اخروٹ زیادہ کھانے

کے نقصان گنوانے شروع کیے تو چندو زور زور سے سر ہلانے لگا۔ باجی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر پھر وہ سمجھ گئیں۔ چندو بے زبان ضرور تھا۔ اس کے باوجود پوری وضاحت اور صراحت سے انہیں بتا رہا تھا کہ گزشتہ روز اس نے جی بھر کے بادام' پستہ اور اخروٹ کھایا تھا پھر بھی خون آیا تھا' نہ کوئی نقصان ہوا تھا۔

باجی شرمندہ ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "چندو بیٹے' ٹھیک ہے تجھے نقصان نہیں ہوا لیکن تجھے یہ تو نہیں معلوم کہ یہ چیزیں کتنی مہنگی ہیں اور تیرے ماں باپ سچ مچ اتنے امیر نہیں کہ ان چیزوں کی بوریاں خرید سکیں۔ کیوں میرا دل دکھاتا ہے۔ اللہ نے دیا تو بوریوں کے حساب سے بھی کھلاؤں گی تجھے مگر ابھی تو اتنی حیثیت نہیں میری۔"

چندو نے باجی کا دامن چھوڑا اور ان کی پنڈلیوں سے سر رگڑنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو..... میں سب سمجھتا ہوں امی۔ معاف کر دیں آئندہ آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔

باجی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولیں "ابھی میں تیرے لیے ناشتا لاتی ہوں۔"

چندو کا ناشتا دو مرحلوں میں مکمل ہوتا تھا۔ پہلا انسانی ناشتا ہوتا تھا۔ اس میں ڈبل روٹی کے سلائس' دودھ' شہد' بالائی اور مکھن ہوتا تھا۔ چندو یہ تمام چیزیں بڑی رغبت سے اور حتی الوسع بے حد تہذیب سے کھاتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں اسے دنبے کا ناشتا ملتا تھا۔ چنے کی دال رات کو بھگو دی جاتی تھی پھر ہری بھری تازہ گھاس ہوتی تھی۔ کبھی دانہ بھی ہوتا تھا۔

چندو کو ناشتا کرانے کے بعد باجی نے کہا "جا چندو اب کھیل۔" پھر انہوں نے اپنے ناشتے کی فکر کی۔ چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر انہوں نے رات کا سالن نکالا اور اسے رات کی بچی ہوئی روٹی کے ساتھ سوارت کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں چائے بن گئی۔ چائے کی پیالی لے کر وہ آنگن میں آ گئیں۔

آنگن میں ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ باجی کے انداز میں عجلت نہیں تھی ورنہ وہ عام طور پر ٹھیک سے ناشتا نہیں کر سکتی تھیں۔ اسکول کے لئے لیٹ ہو جانا بھی

انہیں قبول نہیں تھا اور چندو کے معمولات میں کوئی کمی رہ جائے' یہ بھی وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں مگر اب اسکول کی بقر عید کی چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر سکون سے بیٹھیں پھر انہیں خیال آیا کہ گھر کی صفائی کرلی جائے۔ انہیں صفائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ یہ ان کا فرصت کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ فوراً" ہی گھر کی جھاڑ پونچھ میں جت گئیں۔

○

نعمت آپا کو وہ علاقہ چھوڑے دو سال ہو چکے تھے مگر مہینے پندرھواڑے میں وہ یہاں کا ایک چکر ضرور لگاتی تھیں۔ کچھ اس لیے کہ ان کی جڑیں اب بھی یہیں تھیں۔ یہاں ان کا ایک حلقہ تعلقات تھا جو ابھی تک نئے علاقے میں نہیں بن سکا تھا۔ دوسرے باجی سے انہیں بڑی محبت تھی۔ صحیح معنوں میں تو وہ باجی سے ملنے ہی کے لئے یہاں آتی تھیں۔

اس روز نعمت آپا گلی میں داخل ہوئیں تو سب سے پہلے زیب النساء اپنے دروازے پر کھڑی نظر آگئی۔ اس سے علیک سلیک ہوئی پھر نعمت آپا نے کہا "باجی کی تو آج چھٹی ہوگی۔ گھر پر ہی ہوں گی۔ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" زیب النساء نے جواب دیا پھر مسکرائی "مجھے معلوم ہے' آپ ان سے ملنے آئی ہیں۔ ہم تو آپ کے کچھ لگتے ہی نہیں۔"

"یہ بات نہیں مگر باجی سے تعلق ہی کچھ اور ہے۔ پھر بھی میں سب سے ہی ملتی ہوں۔"

"میں آپ کو چائے پلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ جلدی سے لے آؤ۔ آج دراصل میں ایک کام سے آئی ہوں۔"

"باجی کے پاس؟"

"ہاں۔"

"خیر تو ہے۔" زیب النساء نے انہیں چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔

"ایک مشورہ دینے آئی ہوں..... چندو کے سلسلے میں۔"

"چندو کے سلسلے میں؟ وہ کیا؟" زیب النساء کی آنکھیں چمکنے لگیں "شادی کرائیں گی اس کی؟"

"نہیں۔ میں باجی سے کہوں گی کہ وہ اس کی قربانی کردیں۔" نعمت آپا نے سنجیدگی سے کہا۔

زیب النساء کا ہاتھ سیدھا اپنے دل پر گیا۔ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔ "کیسی بات کرتی ہیں آپا۔ اللہ نہ کرے۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"کیوں بھئی' وہ باجی کا ہی نہیں' گلی کے ہر گھر کا بیٹا ہے..... سچ مچ کا بیٹا۔"

"ارے بھئی' وہ جانور ہے۔ محض ایک دنبہ ہے۔"

"آپ کو لگتا ہوگا۔" زیب النساء نے جذباتی ہو کر کہا۔ آپا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ لڑ پڑتی۔ دلتے لے ڈالتی اس کے "کون اسے جانور کہے گا۔ گھر کو تو چھوڑیں' اس نے باہر بھی کبھی گندگی نہیں کی۔ کون سا ایسا جانور ہے' جو رفع حاجت کے لئے بیت الخلا جاتا ہو' جو انسانوں کی طرح پیار کرتا ہو' ہر بات سمجھتا ہو۔"

"اس کے باوجود بھی وہ جانور ہی ہے۔ کپڑے چبا کر خراب کرتا ہے یا نہیں۔"

"وہ تو میں نے بچوں کو بھی یہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔" زیب النساء نے مدافعانہ انداز میں دلیل دی "میرے کتنے ہی کپڑے چبا ڈالے اس نے۔ ایسے ایسے کپڑے کہ کوئی اور ہوتا تو میں جان سے مار ڈالتی اسے۔ مگر آپا' مجھے چندو سے محبت ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ سبھی اس سے محبت کرتے ہیں' ہر گھر کا کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی نقصان کیا ہے اس نے مگر کسی نے اف بھی نہیں کی۔ گلی کی تو رونق ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور گہری سانس لے کر بولی "آپا..... سوچیں تو چندو ہے کتنا خوب صورت۔" چندو کی تعریفوں میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ آپا اسے قربان کرنے کی تجویز لائی ہیں۔

"بچے تو ہوتے ہی خوب صورت ہیں۔" نعمت آپا نے کہا۔

"کچھ ہوتے ہیں' کچھ نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں' وہ بھی چندو جیسے خوب

صورت نہیں ہوتے۔ آپ یہاں رہتی نہیں ہیں نا' اس لئے آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ میں نے چندو جیسا خوب صورت کوئی نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد' دہانے کے گرد اور چاروں ہاتھ پاؤں پر سیاہ حلقے دیکھیں۔ ایسا میں نے کہیں نہیں دیکھا اور بڑی بڑی آنکھیں دیکھیں ....."

"دنبوں کی آنکھیں بڑی ہی ہوتی ہیں۔" آپا بولیں۔

"بے شک ..... ہوتی ہیں مگر اتنی خوب صورت نہیں ہوتیں اور چندو تو آنکھوں سے تمام باتیں کرتا ہے۔ بتائیں کہیں وہ بے زبان لگتا ہے؟"

"تم اپنی باتوں پر غور کرو۔ تم خود اسے دنبہ ہی سمجھتی ہو .... ایک جانور!"

"وہ تو ہے آپا مگر کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ وہ دنبے کے بھیس میں کوئی اور ہے۔"

"کیا مطلب؟" آپا بری طرح چونکیں "تمہارے خیال میں کون ہے وہ؟"

"کوئی جن' کوئی پری زاد۔ یہ لوگ تو اس طرح کے بھیس میں ہوتے ہیں نا آپا۔"

"سنا تو ہے مگر میں نہیں مانتی۔ چندو میں ایسی کون سی بات دیکھی ہے تم نے؟"

"اس کی آنکھیں آپا ..... مجھے وہ ایسے دیکھتا ہے کہ میں کسی مرد کو اس طرح دیکھتے دیکھ لوں تو پانی پانی ہو جاؤں۔ عبدالصمد کبھی کبھی ایسے دیکھتا ہے تو میں اسے ٹوک دیتی ہوں اور چندو ہمیشہ مجھے ایسے ہی دیکھتا ہے اور وہ مجھ سے جیسے لپٹتا ہے' جیسے مجھے پیار کرتا ہے' کسی کو نہیں کرتا۔ آپا یہاں چومتا ہے ..... یہاں۔" زیب النسا نے ہونٹوں کی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا پھر وہ شرما گئی۔

آپا اب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "اچھا' فرض کرلو' وہ دنبے کے جسم میں کوئی اور ہے تو تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر لگتا ہے آپا۔" زیب النسا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "پر اس کی محبت جیت جاتی ہے۔ پیار آنے لگتا ہے اس پر۔ مجھے بہت محبت آتی ہے اس کی۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ دنبہ ہی ہے۔" آپا نے کہا

"اچھا میں چلتی ہوں۔"

"باجی سے یہ بات نہ کہئے گا۔ وہ بہت ناراض ہوں گی۔ اپنا بیٹا کوئی قربان کرتا ہے آپا۔"

"یہ قربانی کی رسم یادگار ہی بیٹے کو قربان کرنے کی ہے۔" آپا اٹھ کھڑی ہوئیں۔

○

صفائی سے فارغ ہونے کے بعد باجی چندو کی واسکٹ لے بیٹھیں۔ زوبیت کی یہ واسکٹ وہ اسے عید کے دن پہنانے کے لیے سی رہی تھیں۔ بہت خوب صورت واسکٹ تھی۔ سیتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ چندو دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پکارا "چندو؟"

چندو جاتے جاتے رک گیا۔

"دور نہ جانا۔ گلی میں ہی رہنا۔ ایک آواز پر چلے آنا۔ سمجھے چندو۔"

چندو باہر چلا گیا۔ باجی پھر مشین پر جھک گئیں۔ دو منٹ بعد دروازے پر آہٹ ہوئی تو انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے خیال میں چندو واپس آیا تھا مگر نعمت آپا کو دیکھ کر وہ مسکرا دیں "آؤ نعمت، کیسے رستہ بھول پڑیں؟"

"آپ یہ بات کہہ رہی ہیں باجی۔" نعمت آپا کے لہجے میں شکایت تھی "جب کہ مہینے میں دو بار میں لازمی طور پر آتی ہوں۔"

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آؤ بیٹھو۔ میں یہ واسکٹ مکمل کر کے تمہیں چائے پلاؤں گی۔"

"یہ واسکٹ کس کی ہے؟"

"چندو کی ہے۔ عید پر پہناؤں گی اسے۔" باجی نے کہا "بس تھوڑی سی سلائی رہ گئی ہے۔ پرسوں تو عید ہے نا۔"

آپا کا دل بیٹھنے لگا۔ اب وہ قربانی کی بات کیسے کریں۔ یہاں تو عید کی تیاری ہو رہی ہے۔

باجی تمام وقت چندو کی باتیں کرتی رہیں۔ چندو کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں

تھا۔ چندو کچھ زیادہ ہی شریر ہوگئے ہیں مگر فرماں برداری میں کمی نہیں آئی ہے۔ چندو میاں یہ کرتے ہیں' چندو میاں وہ کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات تھی باجی میں۔ چندو کے غیاب میں وہ اس کے متعلق گفتگو بہت احترام سے کرتی تھیں۔ سامنے تو تڑاخ ہوتی تھی مگر موجود نہ ہوتے تو چندو میاں محترم ہو جاتے۔

باجی نے چندو کا گزشتہ روز والا ایڈونچر آپا کو سنایا۔ ڈرائی فروٹ والا۔ آپا مسکراتی رہیں مگر دل میں خود کو ملامت کرتی رہیں۔ جو کہنے کا ارادہ کرکے آئی تھیں' کہہ دیتیں تو باجی کا تو دل خون ہو جاتا۔ ممکن ہے' تعلقات ہی ختم ہو جاتے۔

باجی نے واسکٹ مکمل کی' اسے کمرے میں رکھا اور چائے بنانے چلی گئیں۔ اس دوران نعمت آپا اپنی تجویز کے سلسلے میں غور و فکر کرتی رہیں۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ باجی کو اس طرح کا مشورہ دینا مخدوش ضرور ہے مگر ان کی نیت صائب ہے' اس لیے وہ دے سکتی ہیں۔

باجی چائے لے آئیں۔ چائے پی گئی اور اس دوران بھی چندو میاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پینے کے بعد آپا نے اچانک کہا۔ "یہ چندو کہاں غائب رہتا ہے۔ کب سے میں نے نہیں دیکھا اسے۔"

"ارے یہیں گلی میں کھیل رہا ہے۔ ایک آواز دوں گی تو چلا آئے گا۔" باجی نے بڑے مان سے کہا۔

"تو پھر ذرا بلائیں تو اسے۔"

"چندو ..... چندو بیٹے۔" باجی نے دروازے کی طرف منہ کرکے پکارا "آجا میرے بیٹے۔"

چند سیکنڈ بعد ہی چندو مستانہ وار چلتا گھر میں داخل ہوا۔ آتے ہی باجی کی گود میں گھس کر لیٹ گیا "دیکھا' کتنا کہنا مانتا ہے۔ میں نے کہا تھا' دور نہ جانا۔ گلی میں ہی کھیلنا۔" باجی نے فخریہ لہجے میں کہا۔

نعمت آپا چندو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ زیب النساء نے سچ کہا تھا۔ چندو واقعی بہت خوب صورت ہے۔ آنکھوں کے گرد' تھوتھنی کے گرد سیاہ حلقے بہت ہی خوب صورت لگتے تھے اور اس کی آنکھیں ..... وہ واقعی غیر معمولی تھیں۔ وہ بولتی

تھیں۔ وہ اس وقت باجی کو جس محبت سے دیکھ رہا تھا' وہ واضح اور یقینی تھی اور باجی اس سے جو محبت کرتی تھیں' وہ تو اظہر من الشمس تھی۔

"باجی ..... آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا برا چاہنے والی نہیں۔" نعمت آپا نے تمہید باندھی۔

"جانتی ہوں نعمت۔ بات کیا ہے؟"

"میں ایک ایسی بات کہنا چاہتی ہوں' جو آپ کو بہت سخت لگے گی۔ ناگوار گزرے گی۔ ہوسکتا ہے' آپ میری نیت پر بھی شک کریں۔"

"کچھ بھی ہو' تم کہہ دو۔" باجی نے گھمبیر لہجے میں کہا "اس لیے کہ تمہارے نزدیک اسے کہنا ضروری بھی ہے۔ ورنہ تم یہ تمہید نہ باندھتیں۔"

نعمت آپا سوچ میں پڑ گئیں۔ وہ پوری دنیا میں گھوم پھر کر لفظوں کے حسین ترین پھول جمع کریں اور پھر اس بات کو گل دستے کے روپ میں باجی کو دیں' تب بھی باجی کے لئے تو وہ کھینچ کر مارا ہوا پتھر ہی ہوگا "باجی ..... میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ آپ اس سال چندو کی قربانی کردیں۔"

پہلے تو باجی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر جب سمجھیں تو وہ بے یقینی سے نعمت آپا کو گھورتی رہیں "کیا مطلب ہے تمہارا؟" ان کے لب ہلے "چندو کی قربانی کردوں؟ اپنے بیٹے کی قربانی کردوں؟" انہوں نے سر جھکا کر گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے چندو کو دیکھا' جو انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

"جی باجی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا ہے۔"

"نعمت' مجھے تمہارے خلوص پر' تمہاری نیت پر پورا بھروسا ہے اس لئے یہ بات برداشت کرلی ہے۔" باجی کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا "گلی میں تو کیا اس پورے علاقے میں کوئی اور مجھ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لیے نہیں کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں اس لیے کہ وہ سب چندو سے محبت کرتے ہیں ..... اور جانتے ہیں کہ چندو کے لئے میری محبت ان سے ہزار گنا بڑی ہے اور تم نے یہ بات اس لیے اتنی آسانی سے کہہ دی کہ تم یہاں سے چلی گئی تھیں' جب میں نے چندو کو پالا۔ تم نے اسے پلتے ہی نہیں دیکھا۔ اس کی شرارتیں' اس کی محبت بھری

ادائیں نہیں دیکھیں۔ جس نے یہ سب کچھ دیکھا ہے' مجھ سے یہ کہتے ہوئے اس کا دل پھٹ جائے گا۔"

نعمت آپا کو دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے تو واقعی چندو کو نہیں دیکھا۔ دیکھنے والوں میں ایک زیب النساء سے تو وہ بات کر چکی تھیں۔ اس کا ردعمل وہی تھا' جو باجی بتا رہی تھیں "باجی .... میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ یہ قربانی کا موقع ہے۔"

"دیکھو نعمت' میں صاحب نصاب نہیں ہوں۔ ہوتی تو بھی میں بازار سے جانور خرید لاتی۔ اپنا بیٹا تو قربان نہ کرتی۔"

"بازار سے جانور تو سبھی لاتے ہیں باجی۔" نعمت آپا نے گہری سانس لے کر کہا "قربانی کی روح کو کون سمجھتا ہے۔ اللہ کو کسی کے پیسے کی ضرورت تو نہیں نعوذ باللہ ..... نہ دو ہزار کی نہ ایک لاکھ کی۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کون اس کا کتنا فرماں بردار ہے۔ کون اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔"

نعمت آپا نے جس گداز لہجے میں بات کہی تھی' اس نے باجی کے دل کو چھو لیا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو نعمت۔" انہوں نے بہت نرم لہجے میں کہا "لیکن سوچو تو۔ چندو میرا بیٹا ہے ..... میری کائنات ہے۔ اسے قربان کر کے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔"

"خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں باجی' جو اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دیں۔ وہ خالی ہاتھ تو نہیں رہتے۔ دونوں جہاں ان کے ہوتے ہیں۔ یہ سعادت خود سے تو کما بھی نہیں سکتا کوئی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے نعمت لیکن چندو میرا بیٹا ہے.... سچ مچ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اسے قربان کر دوں....."

"یہی تو اللہ نے کہا ہے باجی۔ اللہ نے حضرت ابراہیم سے ان کی عزیز ترین شے کی قربانی طلب کی تھی ..... اور آخر میں کیا ثابت ہوا۔ یہی نا کہ انسان کو سب سے زیادہ عزیز اولاد ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم نے یہ قربانی پیش بھی کر دی۔ اللہ نے قبول بھی فرمائی اور بیٹا بھی واپس دے دیا آپ کو۔ اسی محبت اور اطاعت کی یادگار تو

ہے یہ قربانی' جو ہم ہر سال پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ واقعی قربانی ہے بھی یا نہیں۔" نعمت آپا کہتے کہتے رکیں پھر گہری سانس لے کر بولیں" آپ خوش نصیب ہیں باجی کہ اللہ نے آپ کو چندو کے لئے اولاد کی سی محبت دی۔ اس لئے کہ کچھ بھی ہو' چندو ہے تو دنبہ ہی .... اور قربانی کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے۔ اللہ نے آپ کے لئے ایک مقبول قربانی کا اہتمام کر دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ کمزور ثابت ہوتی ہیں یا ثابت قدم۔ میری بات مان لیجئے باجی۔"

باجی کا ضبط جواب دے گیا "اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تمہارے خلوص اور نیت پر مجھے یقین ہے مگر اب تم جتنی بار بھی کہو گی' مجھے گناہ گار کرو گی۔ اس لیے کہ میں سو بار انکار کروں گی' ہزار بار انکار کروں گی۔" باجی کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "جیسے تم مجھے سمجھا رہی ہو' میری جگہ تم ہوتیں تو خود کو کبھی نہ سمجھا پاتیں۔ تمہیں اپنا آپ برا لگنے لگتا۔ وہ بات کہنا بہت آسان ہے' جو خود پر Apply نہ ہوسکے۔"

نعمت آپا کے دل پر چوٹ لگی لیکن جانتی تھیں کہ بات سچی ہے۔ اس وقت وہ تصور کرتیں' خود کو باجی کی جگہ رکھتیں تو بھی اپنے ضمیر کی پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتی تھیں کہ یہ بات مان لیتیں۔ اس لیے کہ تصور میں سب کچھ ہوتا ہے مگر روح نہیں ہوتی' محسوسات نہیں ہوتے۔ جب تک وہ کسی چندو کو ماں بن کر ایسے ہی نہ پالتیں' اس سے متعلق اس طرح محسوس نہیں کرسکتیں۔

"اور مثال تم کس کی دے رہی ہو ..... ایک بے حد محترم پیغمبر کی!" اب باجی بپھر گئی تھیں "میں .... ہم ان کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں۔ ہمارے پاس وہ ظرف کہاں۔ ہاں وہ اوپر والا ہی دے تو دے۔ ہم تو جانور ہی قربانی کرسکتے ہیں۔ یا یوں کہہ لو کہ ہزاروں یا لاکھوں روپے قربان کرسکتے ہیں جانور کے روپ میں۔ یہ ضرور ہے کہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔ "وہ کہتے کہتے رکیں۔" اور نعمت' اب تم چلی جاؤ۔ تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے منہ پھیرلیا۔

"ٹھیک ہے باجی۔ مجھے افسوس ہے کہ شاید آج میں نے آپ کو ہمیشہ کے لئے کھودیا مگر میرا دل جانتا ہے کہ میں نے یہ بات بھی آپ کی محبت میں' آپ کی بھلائی

کیلئے کی تھی۔ اچھا باجی جاتی ہوں۔"

باجی نے ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ نعمت آپا بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف چل دیں۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ باجی دانستہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔ انہوں نے چندو کو لپٹا رکھا تھا' اور چندو بڑی محبت سے ان کے رخسار کو چوم رہا تھا۔

نعمت آپا نے اس دید کو اپنی نگاہوں میں محفوظ کیا اور باہر نکل گئیں۔ وہ ہار گئی تھیں!

○

دن کی روشنی میں کوٹھری اتنی خوف ناک نہیں لگ رہی تھی۔ کوٹھری کی چھت میں جو روشن دان تھا' اس سے دھوپ اور روشنی اندر آرہی تھی۔ روشنی اور آگہی کتنی ہی تکلیف دہ ہوں' آخر میں باعث آرام ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اختر نے دن کی روشنی میں اپنے جسم کا جائزہ لیا تو پہلے تو کانپ گیا۔ اصغر کا ردعمل بھی یہی تھا مگر پھر دھیرے دھیرے سکون آگیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اندھیرے میں تو وہ سوچ رہا تھا کہ ان چوٹوں سے جاں بر ہی نہیں ہوسکے گا۔

روشنی کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ انہیں معلوم ہوگیا کہ کہاں مرہم لگانا ہے' کہاں ہلدی کا لیپ کرنا ہے اور کہاں سنکائی۔ فیضو لالٹین میں پوری طرح تیل بھر کے لایا تھا۔ اصغر نے بتی نیچے کردی۔ دن میں اسے صرف سنکائی کے لئے استعمال کرنا تھا۔

اصغر کو تو صبح سویرے ہی سے بھوک ستا رہی تھی۔ اختر کی چوٹوں کو ذرا آرام آیا تو اسے بھی بھوک لگنے لگی۔ وہ دونوں فیضو کا انتظار کر رہے تھے۔ اب دھوپ گھڑی بتا رہی تھی کہ دوپہر ہونے والی ہے۔ اب انہیں فیضو کے نہ آنے سے پریشانی ہو رہی تھی ..... بھوک کے سلسلے میں نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے بارے میں کوئی خطرناک فیصلہ نہ کرلیا گیا ہو۔

"میں تو کہتا ہوں' تجھے شاہ جی سے معافی مانگ لینی چاہیے۔" اصغر نے کہا۔

"اس حرامی سے ..... میں مرجاؤں گا مگر اس سے معافی نہ مانگوں گا۔" رسی جل

گئی تھی مگر بل نہیں گئے تھے۔

"کیا پتا وہ سچ مچ ہمیں مار کر صحن میں گڑوا دے۔ تو نے مجھے بھی مروا دیا۔"

مگر دن کی روشنی میں یہ تصور اختر کے لئے بے جان تھا کہ انہیں مار کر صحن میں گاڑ دیا جائے گا "اندھی لگ رہی ہے کیا۔" اختر نے تند لہجے میں کہا مگر اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ اتنے دور کا امکان بھی نہیں ہے "ماریں گے تو رات کو ہی ماریں گے نا۔" اس نے جلدی سے کہا "اور رات ہونے سے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

اصغر کی نظریں کونے میں رکھی کدال کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے اختر کو فیضو کی کہی ہوئی تمام باتیں بتا دی تھیں "تو کیا ہم دن میں دیوار توڑیں گے؟"

"نہیں تو کیا رات کو صحن میں گاڑے جانے کا انتظار کریں گے۔ اسی کدال سے؟" اختر نے چڑ کر کہا۔

"مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے یار۔ فیضو بھائی کیوں نہیں آئے؟"

اختر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔ وہ وسوسوں میں گھرے ہوئے تھے۔

خاصی دیر کے بعد کوٹھری کے باہر کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ وہ جانتے تھے' یہ ضروری نہیں کہ آنے والا فیضو ہی ہو۔ ممکن ہے' ان کے لئے کوئی افتاد ہی ہو۔

لیکن آنے والا فیضو ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی اور پیالیاں اور ایک تھیلی تھی' جس میں پاپے تھے۔ یہ ساری چیزیں اس نے دری پر رکھ دیں۔

"اتنی دیر کر دی فیضو بھائی۔" اصغر نے شکایت کی۔

"اب بھی جان پر کھیل کر آیا ہوں۔" فیضو نے کہا اور پھر وضاحت کی "شاہ جی نے سختی سے حکم دیا ہے کہ کوٹھری میں کھانے کی کوئی چیز نہ جائے۔ مجھے موقع ہی نہیں مل رہا تھا آنے کا۔ اگر شاہ جی کو پتا چل جائے کہ میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے زمین میں۔"

گاڑنے کے حوالے نے دونوں بچوں کو لرزا دیا۔ انہوں نے عجیب سی نظروں

سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لیے۔

فیضو نے پیالیوں میں چائے انڈیل کر انہیں دی اور پاپوں کی تھیلی کی طرف اشارہ کیا "لو.... کچھ پیٹ میں ڈال لو۔"

دونوں بچے پاپے چائے میں بھگو بھگو کر کھانے لگے۔

"اب تیری چوٹیں کیسی ہیں اختر؟"

"اب تو بہت آرام ہے فیضو بھائی۔ چل پھر بھی سکتا ہوں۔" اختر نے جواب دیا۔

"شکر ہے اللہ کا۔ جب اس کوٹھری میں، میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا تو میں تو سمجھا کہ تو گیا۔ بہت برا حال تھا تیرا۔" فیضو اصغر کی طرف مڑا "میں گرم ہلدی بھی لایا ہوں۔ ناشتا کرتے ہی یہ بھی لگا دینا۔ درد بالکل ختم ہو جائے گا انشاء اللہ۔"

اصغر نے اثبات میں سر ہلایا اور اختر اسے ممنونیت سے دیکھنے لگا "تم نے بڑی مہربانی کی ہے فیضو بھائی۔"

"مہربانی کیسی۔" فیضو نے شرم ساری سے کہا "میرے اپنے بچے بھی ہیں تم جیسے۔ جیسے وہ ویسے تم۔"

دونوں بچوں نے چائے اور پاپے ختم کر لیے۔

"اب تھوڑی دیر میں دوپہر کا کھانا ہوگا مگر میں رات سے پہلے تمہارے لیے کچھ لا نہیں سکوں گا۔" فیضو نے کہا پھر اس نے کونے میں پڑی کدال کی طرف دیکھا "مگر میری دعا ہے کہ اس سے پہلے ہی تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔ شاہ جی بڑا ظالم آدمی ہے۔"

دونوں بچوں نے بھی کدال کو دیکھا اور سر ہلا دیے۔ "اللہ تمہیں خوش رکھے فیضو بھائی..... اور محفوظ رکھے۔" اختر نے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" فیضو نے کیتلی اور پیالیاں سمیٹتے ہوئے کہا "اور ہاں، کبھی کسی کو نہ بتانا کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ بھلائی کی ہے۔ نکلنے سے پہلے شاہ جی کے ہتھے چڑھ جاؤ تو اس کے سامنے بھی زبان نہ کھولنا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا فیضو بھائی۔ تم بے فکر رہو۔" اختر نے کہا۔
فیضو چلا گیا۔ اصغر نے اختر سے کہا "لا میں یہ گرم گرم ہلدی لگا دوں۔"
"ہاں لگا دے۔" اختر بولا اندھیرا ہونے سے پہلے میں جتنا بہتر ہو جاؤں' اچھا ہے۔"
"کیا ارادہ ہے؟"
"اندھیرا ہونے سے ذرا پہلے ہی کام شروع کردیں گے۔" اختر نے کدال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

○

پہلا نوالہ لیتے ہی میمونہ نے کہا "واہ امی۔ یہ تو بڑے مزے کا سالن پکایا ہے آپ نے۔" یہ سب کچھ طے شدہ تھا۔ سلمی بیگم نے اسے رات کو ہی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ رائے عامہ کو کیسے ہموار کیا جاتا ہے۔
مگر جب میمونہ نے صحیح معنوں میں اس نوالے کا ذائقہ محسوس کیا تو اس کا دل خوش ہوگیا "واقعی امی' یہ تو بہت مزے کا ہے۔" اس کے لہجے میں مسرت اور استعجاب کا عجیب امتزاج تھا "آج تو میں ڈٹ کر کھانا کھاؤں گی۔"
سلمی بیگم نے مسکراتے ہوئے دونوں لڑکوں کو دیکھا' جو ناک بھوں چڑھا رہے تھے "کھا کر تو دیکھو۔"
دونوں اب بھی ہچکچا رہے تھے "فیضی ..... اشعر.... واقعی بہت مزے کا ہے۔" میمونہ نے انہیں یقین دلایا۔ وہ خود بھی بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔
اس کے کہنے پر اشعر نے پہلا نوالہ لیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "واقعی مزے کا ہے۔"
فیاض نے بھی پہلا نوالہ لیا اور منہ بنا کر بولا "اچھا ہے لیکن گوشت نہیں ہے۔"
"مجھے تو بھئی یہ گوشت سے اچھا لگ رہا ہے۔" میمونہ نے کہا۔
"گوشت سے اچھا تو نہیں ہے۔ ہاں گوشت جتنا اچھا ہے۔"

اشعر نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

اب چھوٹا فیاض بھی رغبت سے کھا رہا تھا۔ سلمی بیگم بچوں کو بڑی محبت سے دیکھتی رہیں۔ آج انہیں بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اچانک اشعر نے کہا "لیکن امی، آپ گوشت کیوں نہیں پکاتیں؟"

"بیٹے، زیادہ گوشت کھانا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ دانے نکل آتے ہیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔" سلمی بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر ہمارے ہاں تو بہت دن سے گوشت نہیں پکا ہے۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے بیٹے۔ بس اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔ پتا ہے، دنیا میں کتنے بچے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں دوپہر کا کھانا نہیں ملتا اور ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں رات کا کھانا بھی نہیں ملتا۔"

"پھر وہ تو بہت روتے ہوں گے امی۔" فیاض نے پریشان ہو کر کہا۔

"ان میں جو اچھے بچے ہوتے ہیں، وہ اللہ کا شکر ادا کرتے اور رزق کی کشادگی کی دعا مانگتے ہیں ..... اور جو برے بچے ہوتے ہیں، وہ روتے اور ضد کرتے ہیں۔"

"میں تو اچھا بچہ ہوں۔" فیاض نے فخریہ لہجے میں کہا "میں نہیں روتا۔"

"لیکن امی، کل گوشت ضرور پکائیے گا۔" اشعر نے شوشہ چھوڑا۔

"جی امی، کل گوشت نہیں ہوا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

فیاض بھی پھیلنے لگا۔

"کل تو میں تمہیں ایسی مزے کی چیز کھلاؤں گی، جو گوشت سے بھی اچھی ہوتی ہے۔" سلمی بیگم نے بہلانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ مجھے تو گوشت ہی چاہیے۔"

"اس چیز میں گوشت سے زیادہ پروٹین ہوتے ہیں۔" سلمی بیگم نے بتایا۔

"امی، ہم گوشت پروٹین کے لیے تو نہیں کھاتے۔" اشعر نے اعتراض کیا۔

"کل تو میں گوشت ہی کھاؤں گا بھئی۔" فیاض نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔

"کل میں تو لوبیا پکاؤں گی بھئی اور دیکھنا، تم انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔"

"انگلیاں چاٹنا تو بدتمیزی ہوتی ہے امی۔" فیاض نے جلدی سے کہا۔

"ارے پگلے، یہ محاورہ ہے۔" سلمی بیگم نے محبت سے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔

"مگر امی، کل گوشت ....." فیاض کی سوئی اسی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"بیٹے کل نہیں۔ بس کل اور صبر کرلو۔ پرسوں میں تمہیں جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی انشاء اللہ۔"

"بہت سارا۔"

"ہاں اتنا کہ گوشت ختم نہیں ہوگا اور تم میز سے اٹھ جاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے امی۔"

"لیکن شرط یہ ہے کہ تم آج بھی اور کل بھی خوب اچھی طرح پیٹ بھر کے کھانا کھاؤ گے اور اللہ کا شکر ادا کرو گے۔"

"ٹھیک ہے امی۔"

سلمی بیگم خوش تھیں کہ بچوں نے اچھی طرح کھانا کھایا ہے۔ ایک دن اور گزر گیا تھا۔ اب کل ہی کی تو بات ہے۔

○

ان کے پاس وقت کے اندازے کے لئے بس کوٹھری کا روشن دان تھا۔ اب روشن دان سے روشنی نظر نہیں آرہی تھی مگر روشن دان تاریک بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شام ہوچکی ہے اور تھوڑی دیر میں سورج غروب ہونے والا ہے۔

ہلدی کے لیپ نے جادو کر دکھایا تھا۔ اختر کے کچھ زخم تو ابھی ہرے تھے لیکن ہڈیوں اور جوڑوں سے درد رخصت ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ اٹھ کر کوٹھری میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ وہ آزمائشی چہل قدمی تھی "میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے مسرت بھرے لہجے میں یہ اعلان کیا "میں یہ دیوار بھی توڑ سکتا ہوں۔"

اصغر نے شک آمیز نظروں سے اسے دیکھا" ابھی چوٹیں نظر آرہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"ان سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں درد اور تکلیف کی وجہ سے پریشان تھا۔" اختر نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے جاکر کدال اٹھائی اور اسے دیوار پر چلایا "دیکھا۔" اس نے فخریہ لہجے میں دیوار سے گری ہوئی مٹی دکھائی۔

"مگر یار تو چاہتا کیا ہے؟"

"ہمیں رات ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا ہے۔"

"ہم جائیں گے کہاں۔ ہمارا تو کوئی ہے ہی نہیں۔" اصغر ڈر رہا تھا "اتنے بڑے شہر میں مارے مارے پھریں گے۔"

"تو چاہتا ہے کہ ہم یہاں مار کر گاڑ دیے جائیں؟"

یہ خیال اصغر کو پہلے ہی سے دہشت زدہ کر رہا تھا "باہر پولیس پکڑ لے گی تو؟" اس نے اعتراض کیا مگر اس کے انداز میں نیم رضامندی تھی۔

"پولیس جان سے تو نہیں مارے گی۔"

"ہاں نہیں مارے گی۔" اصغر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن پولیس نے پکڑ کر دوبارہ یتیم خانے بھیج دیا تو؟" اس نے ایک نیا خدشہ دریافت کیا۔

اختر چند لمحے سوچتا رہا "ایسا ہوگا نہیں۔ ہم پولیس والوں کو سب کچھ بتا دیں گے پھر بھی انہوں نے ہمیں واپس بھجوا دیا تو شاہ جی ہمیں جان سے مارنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"

یہ بات اصغر کے دل کو لگی مگر بنیادی طور پر وہ ڈرپوک اور نرم بچہ تھا۔ وہ اب بھی ڈر رہا تھا۔ اختر نے یہ بات بھانپی تو فوراً" دھمکی دی "ٹھیک ہے۔ تجھے یہاں مرنا پسند ہے تو تو یہاں رہ۔ میں تو نکل جاؤں گا۔"

اصغر نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا "میں تو تیری وجہ سے مصیبت میں پھنسا ہوں اور تو ایسا کہہ رہا ہے۔"

اختر نے پھر کچھ غور و فکر کیا "تجھے تو کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں۔ تو یہیں رہ۔"

"نہیں۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اصغر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اتنی دیر میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ انہوں نے لالٹین کی بتی اوپر کی اور دیوار توڑنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ پہلے اصغر نے کدال سنبھالی۔ اسے اعتماد بہت تھا کیوں کہ اس نے رات کو کدال چلا کر دیکھی تھی مگر اب باقاعدہ دیوار توڑتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کام اتنا آسان نہیں، جتنا لگ رہا تھا۔ دیوار کچی ضرور تھی مگر بہت چوڑی تھی اور وہ اس دیوار کو سمجھ بھی نہیں سکے تھے۔ درحقیقت وہ مٹی کی اینٹوں سے بنائی گئی دیوار تھی، جس پر گارے کا خاصا بھاری پلستر کیا گیا تھا۔ پلستر تو آسانی سے ٹوٹتا رہا مگر جب کچی اینٹیں شروع ہوئیں تو کام مشکل ہو گیا۔ دوسرے ایک بار کدال چلانا اور بات تھی۔ مسلسل کدال چلانے میں ہاتھ دکھنے لگے پھر چھالوں کی نوبت آگئی۔

اصغر تھک کر بیٹھا تو اختر نے کدال سنبھال لی۔ اپنی چوٹوں کے باوجود وہ اصغر کے مقابلے میں زیادہ جان دار ثابت ہوا لیکن اس کے ساتھ بھی مسئلہ یہی تھا کہ اس نے کام کو آسان سمجھ کر شروع کیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشکل لگا تو اس کا حوصلہ ٹوٹنے

لگا۔

دونوں باری باری دیوار پر کدال آزماتے رہے۔ مگر ان کے دورانیے سمٹتے گئے۔ ہاتھوں میں چھالے نکلے پھر وہ پھوٹ بھی گئے تو تکلیف اور بڑھ گئی۔ اگر انہیں اپنی دانست میں جان کا خطرہ لاحق نہ ہوتا تو وہ حوصلہ ہار چکے ہوتے اور اب تو وہ دہرے مجرم تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار ان کے دوسرے جرم کا ناقابل تردید ثبوت تھی۔

انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مگر خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر آہٹ پر ان کی جان نکل جاتی۔ یہ دھڑکا لگا تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔ انہیں تو یہ ڈر بھی تھا کہ دیوار پر کدال مارنے کی آواز بلند ہونے کی وجہ سے دور تک سنی جا رہی ہوگی۔ ان کے جسم پسینے میں تر تھے اور سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ جو بھی اپنی باری پوری کرکے آرام کے لئے بیٹھتا' اسے یہ یقین ہوتا کہ اب وقفے کے بعد وہ کدال نہیں اٹھا سکے گا۔ اس کے ہاتھوں میں جان نہیں رہی ہے لیکن ہر بار موت کا خوف ..... گاڑے جانے کا خوف اٹھنے پر مجبور کر دیتا ... اور کدال چلانے پر احساس ہوتا کہ وجود میں کہیں تھوڑی سی توانائی چھپی ہوئی تھی' جو اب کام آ رہی ہے۔

مگر اس بار اصغر کو یقین ہوگیا کہ اب اس میں جان نہیں ہے۔ وہ گر جانا چاہتا تھا "اب مجھ سے نہیں ہوگا۔" اس نے بے بسی سے کدال گراتے ہوئے کہا۔

اختر کا اپنا بھی یہی حال تھا مگر اس کی طبیعت میں جارحیت تھی۔ وہ آسانی سے ہار ماننے کا قائل نہیں تھا۔ وہ محض اپنی قوت ارادی اور اپنی ضد کے زور پر اٹھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اب اس میں طاقت نہیں رہی۔ اس نے بڑی مشکل سے کدال اٹھائی اور اس کا پھل دیوار پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ کدال اس بار نرم مٹی سے ٹکرائی تھی اور خاصی اندر گئی تھی۔ مٹی کا خاصا بڑا ڈھیر ٹوٹ کر گرا تھا۔

پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کدال جھکائے دیوار کو دیکھتا رہا' جس میں اتنا بڑا سوراخ ہونے والا تھا' جس سے وہ باہر نکل سکتے تھے۔ پھر اچانک اس کی سمجھ میں آیا کہ کچی اینٹوں کی دیوار ٹوٹ چکی ہے۔ اور اب صرف دیوار کے دوسری طرف والا گارے کا پلستر باقی ہے۔ وہ بھی بہت کم۔ اس نے دو بار اور کدال ماری پھر

وہ بڑی بے یقینی سے اس سوراخ کو دیکھتا رہا' جس سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سوراخ اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر یہ بتا رہا تھا کہ وہ جیت گئے ہیں۔ اب بس اس سوراخ کو بڑا کرنا تھا۔

"اصغر ادھر آجلدی سے۔" اس نے اصغر کو پکارا۔

اصغر کے لئے اٹھنا بھی مشکل تھا۔ جیسے تیسے وہ اٹھا مگر اس سوراخ کو دیکھ کر اس کا حوصلہ بلند ہوگیا۔ جسم میں جیسے توانائی کا چھپا ہوا خزانہ دریافت ہوگیا۔ اس نے کدال لے کر اندر بیٹھ کر سوراخ کو بڑا کیا۔ اب وہ باہر نکل سکتے تھے۔

"ہم یہاں کوئی چیز نہیں چھوڑیں گے۔" اختر نے کہا "لالٹین بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"فیضو بھائی پر کوئی مصیبت نہ آئے۔"

"ہاں' ٹھیک ہے۔"

اختر نے لالٹین سنبھالی۔ اصغر دری سمیٹنے لگا۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ کہیں عین موقع پر کوئی نہ آجائے۔

○

اسی شام واپسی پر ریاض احمد ایک بدلے ہوئے آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی اور چال میں خود اعتمادی۔ کندھے بھی جھکے ہوئے نہیں تھے۔ اس روز پہلی بار انہوں نے بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ گردو پیش کو دیکھتے ہوئے طے کیا۔ ان کی آنکھیں چمک بھی رہی تھیں۔

اس روز بھی گلی میں امداد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ امداد صاحب اپنے بکرے کی رسی پکڑے ہوئے اسے ٹہلانے کے لئے لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ریاض احمد سے ہاتھ ملایا۔

"کیسے ہیں ریاض صاحب؟"

"اللہ کا شکر ہے جناب!" ریاض احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چہل قدمی ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں۔ بکرے کو پیٹ کی گرانی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"کتنے کا لیا؟"

"بہت بھاؤ تھاؤ کے بعد ۶۴۰۰ کا ملا ہے۔" امداد صاحب نے بتایا "ان دنوں مارکیٹ بہت تیز ہے۔ مجھے تو بھئی ایک گھر کا پلا ہوا بکرا پسند آیا تھا۔ تیس ہزار کا تھا۔ میں لے بھی لیتا مگر ہمارے ہاں تینوں دن قربانی ہوتی ہے۔ میں نے تین بکرے لے لیے۔"

"جی!"

"اور صاحب، ایک بکرا تو میں نے ایسا دیکھا کہ بس۔ قیامت تھا قیامت۔ کل کے اخبار میں تصویر بھی آئی ہے اس کی۔ ڈیڑھ لاکھ میں بکا مگر صاحب، ایسا بکرا تھا کہ دیکھ کر یقین آجائے کہ بارہ افراد کے کنبے کو حشر کے دن بیک وقت پل صراط پار کرا دے گا۔ بہت تگڑا تھا جناب!"

"میں تو سمجھا تھا کہ پل صراط پار کرنے کے لئے روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔" ریاض احمد نے ہنستے ہوئے کہا "کوئی اپنا پیٹ کاٹ کر خلوص دل سے کوئی مرگھلا جانور بھی قربان کرے تو وہ پل صراط پار کرا سکتا ہے۔"

امداد صاحب ان کا طنز سمجھ نہیں سکے "یہ تو سارا طاقت کا کھیل ہے ریاض بھائی۔ بکرا تگڑا نہ ہو تو جہنم میں ہی گرا دے گا اپنے مالک کو۔"

ریاض احمد اس بات سے ڈر رہے تھے کہ امداد صاحب ان سے ان کے بکرے کے متعلق نہ پوچھ لیں۔ اسی لئے وہ اس میں خوش تھے کہ ان کے بچے گھر سے نکلتے ہی نہیں ہیں۔ مگر وہ بستی ایسی تھی کہ لوگ شاید ایک دوسرے پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ گلی میں کم و بیش دو درجن بکرے، دنبے اور گائیں بندھی تھیں۔ اس وجہ سے بھی پردہ رہ جاتا ہو گا۔

"اچھا امداد صاحب، چلتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"کسی دن آئیں نا ہمارے ہاں۔"

"جی انشاء اللہ۔" وہ گھر کی طرف چل دیے۔

اس روز دروازہ سلمیٰ بیگم نے کھولا اور انہیں ان کی تبدیلی فوراً ہی نظر آگئی

"آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔" انہوں نے سلام کے بعد کہا۔

"صرف نظر نہیں آرہا ہوں' خوش ہوں بھی۔" ریاض احمد مسکرائے "آپ چائے پلائیں پھر خوش خبری سناؤں گا۔"

معمول کے مطابق میمونہ نے ان کے جوتے اور موزے اتارے اور لے گئی۔ وہ صوفے پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ پہلی بار وہ اتنے پرسکون تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم کی آرائش کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی بہت اچھی تھی۔

کیسی عجیب بات ہے۔ انہوں نے سوچا۔ میں نے اس گھر میں ایک مہینے سے کچھ زیادہ ہی گزارا ہے مگر میں اس گھر کو آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ جس راستے پر ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک میں صبح و شام چلتا .... آتا جاتا رہا ہوں' اس کے گردو پیش کا مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ آج دیکھا ہے میں نے۔

بات تو عجیب تھی مگر اتنی عجیب بھی نہیں تھی۔ وہ یہاں آئے ہی ایسے حالات میں۔ اب سے ڈیڑھ ماہ پہلے وہ لکھ پتی تھے۔ ان کے پاس سب کچھ تھا۔ بنگلا' گاڑی' دنیا کی ہر نعمت۔ طارق روڈ پر ان کا بہت بڑا اسٹور تھا۔ وہاں کپڑا' گارمنٹ' کاسمیٹکس' غرض دنیا کی ہر چیز موجود تھی اور اسٹور چلتا بھی خوب تھا۔ کروڑوں کا مال تھا اس میں۔ پھر اچانک بدقسمتی ان پر حملہ آور ہوگئی۔

ایک رات دو بجے کے بعد نجانے کیسے ان کے اسٹور میں آگ لگ گئی۔ وقت ہی ایسا تھا۔ امدادی کارروائی ہوتے ہوتے اسٹور میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ جل کر خاک ہوگیا تھا۔ اس میں پریشانی کی ایسی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ اسٹور مال سمیت انشورڈ تھا مگر صورت حال یوں بگڑی کہ ان دنوں اپنے ملک میں بھی امریکا کی طرح انشورنس فراڈ رواج پانے لگا تھا۔ انشورنس کمپنی اس بات کی تصدیق چاہتی تھی کہ آگ دانستہ تو نہیں لگائی گئی ہے۔ صرف انشورنس کلیم کے لئے۔ دوسرے یہ کہ اسٹور میں اتنا مال موجود بھی تھا یا نہیں۔

تفتیش بہرحال پولیس کو کرنی تھی اور اپنے ملک میں پولیس کا ہی نہیں' ہر سرکاری محکمے کا یہی حال ہے۔ کچھ دو اور کچھ لو والا معاملہ ہوتا ہے۔ خواہ لینا تمہارا بنیادی حق ہی کیوں نہ ہو۔ ریاض احمد کے پاس بینک میں چند لاکھ پڑے تھے۔ انہیں

اطمینان تھا کہ وہ بہرحال کنگال نہیں ہیں۔

جس وقت اسٹور میں آگ لگی' اس میں لاکھوں روپے کا ایسا مال تھا' جس کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ ریاض احمد کی بڑی ساکھ تھی۔ ان سے کاروباری تعلق رکھنے والے ان پر اعتماد کرتے تھے اور مال کی ادائیگی کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ وہ نقصان تو انشورنس کمپنی کو پورا کرنا تھا۔

لیکن جب انشورنس کلیم کا معاملہ اٹکا تو سب لوگ پریشان ہونے لگے۔ لوگوں کو کیا پریشان ہونا تھا۔ اصل میں تو ریاض احمد پریشان ہوئے۔ کوئی شخص انشورنس کلیم کا انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ معاملہ تشویش ناک ہونے لگا تو ریاض احمد کے پاس اپنا مکان اور گاڑی فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود وہ تمام ڈیلرز کو نہیں نمٹا سکے اور ان کے پاس دھیلا بھی نہیں رہا۔

جس روز انہوں نے اپنے مکان کا سودا کیا' ان کا ایک عزیز دوست فرشتہ رحمت بن کر ان کے پاس آیا "یار ریاض' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نعمان نے انہیں دلاسا دیا "کل میں امریکا جا رہا ہوں ورنہ یہاں کے معاملات میں بھی تمہاری مدد کرتا۔ فی الوقت ایک کام کر سکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

یہ وہ وقت تھا جب درحقیقت سایہ بھی ریاض احمد کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ایسے میں نعمان انہیں پی آئی بی کالونی لے کر آیا۔ اس نے اپنا مکان انہیں دکھایا۔ مکان میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی "تم جب تک چاہو' یہاں رہ سکتے ہو۔"

نعمان نے انہیں دس ہزار روپے بھی دیے۔ ریاض احمد نے گھر میں دو ماہ کا راشن لا کر ڈالا اور خود انشورنس کلیم کے معاملے میں جت گئے۔ اس کڑے وقت میں انہیں ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس طرح رہ رہے ہیں۔ آج وقت نے انہیں مہلت دی تو انہوں نے اپنے گردوپیش کو دیکھا تھا ورنہ اس احساس نے انہیں شل کر رکھا تھا کہ ان کے بچوں پر اس عرصے میں کیا گذری رہی ہے۔ وہ جو نازو نعم سے پالے گئے تھے' اب چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترس رہے تھے۔

سلمیٰ بیگم نے انہیں چونکا دیا۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ انہوں نے چائے کی پیالی شوہر کے سامنے رکھ دی "اب فرمایئے۔"

ریاض احمد نے اطمینان سے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولے "انشورنس کلیم منظور ہوگیا ہے۔"

سلمیٰ بیگم بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہیں "سچ؟"

"جی ہاں۔ مکمل کلیم منظور ہوا ہے۔ پہلا چیک میں آج جمع کرا آیا ہوں۔"

سلمیٰ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں "اللہ تیرا شکر ہے۔"

"پھر بھی میں خالی ہاتھ آیا ہوں۔" ریاض احمد نے اداسی سے کہا "چیک اتنی دیر میں ملا کہ بینک کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ میں خالی ہاتھ ہی آیا ہوں اور کل سے بینک کی بقرعید کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ اس میں اداس ہونے کی کون سی بات ہے۔" سلمیٰ بیگم نے خفگی سے کہا "خواہ مخواہ ناشکرا پن کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کتنا بڑا کام اتنی آسانی سے ہوگیا۔ ہم تو خدا کا جتنا شکر ادا کریں، کم ہے۔"

"بے شک۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ لیکن بچوں کے کپڑے نہیں بن سکیں گے۔"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کے پاس نئے کپڑے موجود ہیں۔"

"اور آپ؟"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب ہم بچے تو نہیں ہیں، بچوں والے ہیں۔"

"میں نے بینک مینجر سے بات کرلی ہے۔ پوری تو نہیں، لیکن عید کے تیسرے دن کچھ رقم میں نکال سکوں گا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم قربانی کر سکیں گے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ لیکن ریاض صاحب، قربانی تو ہمیں ہر حال میں کرنی تھی.... اور ہم کرتے بھی۔"

ریاض احمد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے بیوی کو تکتے رہے۔

"دیکھیں نا، ہم صاحب نصاب ہیں۔ میرے پاس اتنا زیور ہے۔ حالات کیسے ہی ہوں، قربانی تو ہم پر واجب تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ زیور بیچ کر قربانی کردوں گی۔"

"اوہ.... مجھے تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

"مگر جناب، آج مجھے یقین ہوگیا تھا کہ بس اب دن پھرنے والے ہیں۔ اچھا وقت شروع ہو رہا ہے۔" سلمیٰ بیگم مسکرائیں۔

"یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟"

"آج میں نے کھنڈویاں پکائی تھیں۔ بچوں نے بہت شوق سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اس تمام عرصے میں یہ پہلا موقع ہے۔"

"مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر۔" ریاض احمد بولے "لیکن افسوس بھی ہوا کہ میں گوشت نہیں لاسکا۔"

"میں نے انہیں سمجھا دیا کہ پرسوں جی بھر کے گوشت کھالیں۔ ظاہر ہے' پڑوس سے گوشت آئے گا ہی اور پرسوں تو اپنے گھر بھی قربانی ہوگی۔"

"انشاء اللہ۔" ریاض احمد نے کہا "ویسے سلمی بیگم' یہ تو بتایئے کہ یہ سخت وقت کیسا لگا؟"

"اس عرصے میں میری سمجھ میں وہ کچھ آیا' جو میں کبھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔" سلمی بیگم نے گہری سانس لی "میرا خیال ہے' سخت وقت اپنی حماقتوں کی وجہ سے آئے یا تقدیر کی وجہ سے' وہ بہرحال آزمائش ہوتا ہے۔ اللہ دیکھتا ہے کہ بندہ اس کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اس سے مدد اور حوصلہ مانگتا ہے یا نہیں اور یہ بھی بتا دوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم پر تو برا وقت آیا ہی نہیں۔ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی مل گیا۔ بچے بھی اچھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے ایک وقت بھی فاقہ نہیں کیا۔"

ریاض احمد جھرجھری لے کر رہ گئے "سلمی بیگم' آپ بہت اچھی ہیں۔"

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہیں ریاض صاحب!"

○

اس رات بھائی جان کو احساس ہوا کہ ان کی بیوی پریشان ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی تھیں۔ کسی بات پر توجہ نہیں دے رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ جواب دینا پڑا تو وہ بھی بے دھیان میں دیا۔

اس وقت وہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ "آج آپ نے چھٹی منائی؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" باجی نے مختصراً کہا۔

"کوئی آیا تھا؟"

"جی--- نعمت آئی تھی۔"

"اور آپ کی کیا مصروفیات رہیں؟"

"چندو کی واسکٹ مکمل کر لی تھی۔" پہلی بار باجی کے لہجے میں دلچسپی کا رنگ جھلکا۔

"واہ--- مجھے بھی دکھائیں۔"

"دیکھ لیجئے گا جلدی کیا ہے۔"

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اصولاً اس معاملے میں باجی کو بچوں کی طرح ایکسائیڈ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ بھائی جان نے بھی زور نہیں دیا۔ معاملہ تفتیش طلب معلوم ہوتا تھا "اور چندو میاں کی کیا مصروفیات رہیں؟ کوئی نیا کارنامہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بے چارہ دن بھر اداس رہا۔ گھر میں پڑا رہا۔"

بھائی جان کا ماتھا ٹھنکا "کیوں بھئی' خیریت تو ہے؟"

"بس ایک ایسی بات سن لی تھی اس نے کہ خوف زدہ ہو گیا ہوگا۔" باجی نے آہ

Rehan

بھر کر کہا۔

"کس نے.... کیا کہہ دیا؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" باجی نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

بھائی جان خاموش ہو گئے۔ جانتے تھے کہ بیگم خود ہی بتا دیں تو بتا دیں ورنہ ان سے کوئی بات اگلوانا ممکن نہیں ہے۔ باجی برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئیں۔ بھائی جان نے پاؤں پھیلا لیے اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گئے۔ بیگم کے رویے نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ دو منٹ بیٹھے ہوں گے کہ چندو آگیا۔ پہلے تو وہ ان کے جسم سے سر رگڑتا رہا پھر اس نے دونوں اگلے پیران کے دونوں کندھوں پر رکھے اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بھائی جان خوش تو بہت ہوئے مگر کڑے لہجے میں بولے "چندو میاں' آپ بہت مطلبی ہیں۔ بغیر غرض کے آپ کبھی کسی کو پیار نہیں کرتے۔"

اس پر چندو نے کچھ آوازیں نکالیں۔ جیسے بھائی جان کی تردید کر رہا ہو۔

"جی نہیں۔ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" بھائی جان نے کہا۔ "آپ خود بتائیں۔ کبھی صبح دفتر جاتے ہوئے آپ نے مجھے پیار کیا۔ اس وقت جو آپ مجھے پیار کر رہے ہیں تو درحقیقت مجھے یاد دلا رہے ہیں کہ ٹہلنے کے لئے بھی جانا ہے۔"

چندو نے سر ہلاتے ہوئے پھر کچھ آوازیں نکالیں۔

"چلئے .... چلتے ہیں۔" بھائی جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

بھائی جان چہل قدمی کے دوران چندو سے دنیا زمانے کی باتیں کرتے تھے۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی دنبہ ہے۔ ان کا انداز تو ایسا ہوتا تھا' جیسے کسی دوست سے تبادلہ خیال کرتے ہوں۔ چندو بھی ہنکارے بھر بھر کے گویا گفتگو میں شامل رہتا تھا۔

"اب چندو میاں' آپ ہی بتائیں۔ قانون اور تعزیرات کا ہتھیار حکومت کے پاس ہے یا لوگوں کے۔" بھائی جان پر زور لہجے میں کہہ رہے تھے "تو امن و امان قائم رکھنا حکومت کی ذمے داری ہی ہوا نا۔ پھر یہ ہے کہ قانون تو آپ بنالیں مگر....."

"السلام علیکم بھائی جان۔"

Ahmed

"وعلیکم السلام۔"

"کیسے ہو چندو میاں؟"

چندو میاں نے ہنکاری بھر کر اپنی خیرت سے آگاہ کیا۔ چہل قدمی اور گفتگو کے دوران یہ مداخلتیں چلتی رہتی تھیں۔ بھائی جان اور چندو دونوں اس کے عادی تھے۔ سلام کا جواب دینے کے لئے جہاں سے سلسلہ ٹوٹتا' وہیں سے جوڑ دیا جاتا۔

"ہاں تو چندو میاں' میں کیا کہہ رہا تھا؟"

چندو میاں بھی سوچ میں ڈوب گئے۔ کیا یاد دلائیں ..... لیکن کوئی بتا دے بھولے ہیں ہم جہاں سے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔

مگر بھائی جان کا دماغ بہت تیز تھا۔ وہ کبھی کچھ بھی نہیں بھولتے تھے "ہاں!" میں یہ کہہ رہا تھا کہ قانون سازی تو آپ کریں اور عمل درآمد نہ ہو تو کیا فائدہ۔ بھئی قانون بنائیں تو سختی سے انہیں نافذ بھی کریں۔ صرف قانون بنا دینے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے صرف اچھے قانون بنا دینا کافی ہے تو آپ بہت بھیانک غلطی کر رہے ہیں ...."

پھر مداخلت ہوتی۔ سلام' چندو کی مزاج پرسی' سر کو پیار سے تھپتھپانا۔

"اور بھائی چندو' انسانوں کے لئے سب سے اچھے قوانین تو اللہ میاں نے بنائے اور اتار دیے۔ قرآن حکیم کی صورت میں ....." بھائی جان کی گفتگو پہاڑی دریا کی طرح ہوتی تھی۔ بڑی سے بڑی چٹان اس کے دھارے کو روک نہیں سکتی تھی۔ ہاں دھارے کا رخ ذرا سا تبدیل ہو جاتا مگر بہاؤ اور تیز ہو جاتا "..... ہمیں تو صرف ان پر عمل کرنا ہے۔ اسی میں ہماری عافیت ہے ...."

"السلام علیکم بھائی جان۔ کیسے ہیں؟ تم کیسے ہو چندو بیٹے۔"

"اور بھائی' حکومت کیا ہے؟ دیکھو نا چندو میاں' اقتدار اعلیٰ تو صرف اللہ کا ہے۔ اللہ نے اس کا ایک حصہ حکومت کو سونپ دیا ..... اپنی امانت کے طور پر لیکن یہ کبھی کوئی نہیں سوچتا کہ کس لیے۔ اس لئے نہیں کہ تم طاقت کے زعم میں مبتلا ہو جاؤ کہ تم ملک کے سیاہ و سفید کے مالک ہو۔ رعایا کی تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں اللہ نے اقتدار اس لیے دیا کہ تم اس کے بنائے ہوئے قوانین پر لوگوں سے عمل کراؤ

.... سختی سے۔ سو بھائی' قانون سازی مت کرو۔ جو قوانین تمہیں دیے گئے ہیں' ان سے بہتر کوئی قانون تم کبھی نہیں بنا سکتے۔ عمل کرو تاکہ عمل کرا سکو....."

"السلام ..... کیسے ..... چندو میاں .....؟"

"اور میاں' تم اقتدار کو سمجھتے کیا ہو۔ تم اقتدار ملنے پر خوش ہوتے ہو.... جشن مناتے ہو۔ تمہارے اسلاف تھرا جاتے تھے۔ سجدے میں گر کر روتے .... گڑگڑاتے تھے کہ ان پر کتنی بھاری ذمے داری عائد ہوگئی ہے۔ دیکھو نا' حکمران تو اپنی رعایا کے حساب میں بھی شریک ہوں گے۔ دس کروڑ پر حکمراں ہو تو جواب دہی بھی صرف اپنی نہیں' دس کروڑ کی کرنی ہے۔ تمہیں تو حکمرانی ملے تو تم پر افضلیت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے کہ تم دس کروڑ سے افضل ہو....

"میاں' کبھی سوچو تو۔ سب سے زیادہ وسیع و عریض مملکت حضرت عمر کے دور میں تھی اور آپ راتوں کو نیند سے محروم ہوگئے تھے۔ رات رات بھر روتے ..... خوف سے تھرتھراتے کہ کہیں کوئی کتا بھی بھوکا رہ گیا تو جواب دہی انہیں کرنی ہوگی۔ تو بھائی اقتدار ملے تو خوف بڑھ جاتا ہے اور بندے میں عاجزی بھی بڑھ جاتی ہے اور اقتدار کو اقتدار اعلیٰ سمجھ بیٹھو تو فرعون ہو جاؤ گے.....

"اور اب اس پارک کو لو۔ اسے گارڈن کہتے ہیں۔" بھائی جان کے لہجے میں حقارت ہوتی اور اس سے یہ بھی سمجھ لیں کہ وہ میدان میں پہنچ چکے ہیں اور میدان کا چکر لگانے والے ہیں" اور گارڈن میں ٹخنے ٹخنے مٹی ہے۔ گھاس کی ایک پتی اور پھول کا ایک پودا نظر نہیں آتا مگر کاغذات میں یہ ایک ہرا بھرا باغ ہے' جس کے لیے پودے' کھاد اور گھاس خریدی جاتی ہے۔ اس کے لئے چار مالی اور دو چوکی دار بھی ہیں۔ اب پوچھو کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ وصول کرتے ہیں ..... آدھی تنخواہ۔ آدھی مقتدر لوگوں کے پاس چلی جاتی ہے۔ پودے' کھاد اور گھاس اور دوسری چیزیں بھی وہی لوگ کھا جاتے ہیں۔ بتاؤ' کہتے ہیں' آدمی گھاس نہیں کھاتا۔ میں کہتا ہوں' آدمی گھاس بھی کھاتا ہے اور کھاد بھی اور جانتے ہو' کھاد کس چیز سے بنتی ہے ....."

واپسی میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ اپنی گلی سے ذرا پیچھے شیخ صاحب مل گئے۔

شیخ صاحب کو اس علاقے میں آئے ہوئے دو ڈھائی مہینے ہوئے تھے۔ انہوں نے کرائے پر مکان لیا تھا۔ انہوں نے بھائی جان کو سلام کیا' ہاتھ ملایا' چندو کا سر تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے بولے "چندو میاں' کل اور عیش کرلو۔ خوب کھا پی لو میاں۔ تمہیں پتا ہے کہ پرسوں بقر عید ہے۔ کچھ قصائی سے بھی سلام دعا کرلو۔"

بھائی جان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس طرز تخاطب سے انہیں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ گلی کے ..... بلکہ علاقے کے لوگوں نے کبھی ان کے پیٹھ پیچھے بھی ایسی بات نہیں کی تھی "کیا مطلب ہے آپ کا شیخ صاحب؟" انہوں نے کڑوے لہجے میں پوچھا پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے چندو سے کہا "چندو میاں' آپ گھر جائیے۔ میں آتا ہوں۔"

چندو سیدھا اپنی گلی کی طرف چل دیا۔

"ہاں' اب بتائیے شیخ صاحب!"

"مطلب کیا بھائی۔ میرا اشارہ قربانی کی طرف تھا۔" شیخ صاحب بولے "مقبول قربانی تو عزیز ترین چیز کی ہوتی ہے۔"

"آج آپ نے ایسی بات کی ہے' آئندہ نہیں کیجئے گا۔" بھائی جان کا لہجہ نرم مگر مستحکم تھا۔

"اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے بھائی جان؟" شیخ صاحب نے حیرت سے کہا۔

"میں نے آج تک آپ کا گھر نہیں دیکھا۔" بھائی جان نے موضوع ہی بدل دیا۔

"اسی گلی میں رہتا ہوں میں۔ تیسرا مکان ہے بائیں جانب۔"

شیخ صاحب نے اشارے سے بتایا "کبھی تشریف لائیں نا۔"

"آج ہی کیوں نہیں؟"

"زہے نصیب۔ آیئے ....."

شیخ صاحب بھائی جان کو اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے بھائی جان کو بیٹھک میں بٹھایا۔ "ٹھنڈا لیجئے گا یا گرم؟"

اس وقت تو کچھ بھی نہیں۔ آپ کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔"

اسی وقت اندر سے ڈھائی تین سال کا بچہ آیا اور شیخ صاحب کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ شیخ صاحب رہ رہ کر اسے پیار کرتے۔ وہ شیخ صاحب کی داڑھی سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ کبھی کھینچتا' کبھی سہلانے لگتا۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے ماشاء اللہ؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"ماشاء اللہ پانچ ہیں۔ تین بیٹیاں' دو بیٹے۔" شیخ صاحب نے فخریہ لہجے میں بتایا "سب سے بڑی بیٹی دس سال کی ہے اور یہ سب سے چھوٹا ہے۔" انہوں نے گود میں بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے' یہ آپ کو سب سے پیارا ہے۔"

"یہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے بھائی جان۔ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ مجھے سب سے عزیز ہے۔"

بھائی جان اٹھ کھڑے ہوئے "میں اب چلتا ہوں۔ تعلقات رہے تو پھر ملاقات ہوگی۔" دروازے پر پہنچ کر وہ رکے اور مڑے۔

"بس تو اس بار بقر عید پر آپ اپنے اس بچے کو قربان کر دیجئے گا۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔"

شیخ صاحب ہکا بکا رہ گئے "یہ کیا بکواس ....؟"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مقبول قربانی عزیز ترین چیز کی ہوتی ہے۔"

"یہ میرا بیٹا ہے ....." شیخ صاحب لحہ بہ لحہ غضب ناک ہوتے جا رہے تھے۔

"اور چندو میرا بیٹا ہے۔" بھائی جان نے بے حد شیریں لہجے میں کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں اور سمجھیں' چندو دنبہ ہے۔"

"آپ اپنے پانچ بچوں سے جتنی محبت کرتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ میں اپنے چندو سے محبت کرتا ہوں۔ سمجھے۔" بھائی جان نے کہا اور پلٹ کر باہر چلے گئے۔

شیخ صاحب اچانک بن کی وجہ سے دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر بات کی معنویت اور کاٹ جیسے جیسے ان پر روشن ہوئی۔ ان کا غصہ بڑھتا گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ غصے کی شدت سے لرزنے لگے۔ انہوں نے بچے کو ایک طرف پٹخا اور

باہر بھاگے۔ باہر نکل کر انہوں نے دیکھا تو بھائی جان گلی کے نکڑ پر تھے "او الو کے پٹھے بھائی جان۔" انہوں نے للکارا "ٹھہر تو جا' میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

بھائی جان رکے اور پلٹے "آیئے حضرت' میں آپ کا منتظر ہوں۔" انہوں نے چیخ کر کہا "اگر میں آپ کو بہت عزیز ہو گیا ہوں تو مجھے قربان کر دیجئے۔"

"میں واقعی تجھے ذبح کر دوں گا۔" شیخ صاحب ان کی طرف بڑھنے لگے۔

چند لمحوں میں گلی میں مجمع لگ گیا۔ لوگوں کو بات کا پتا چلا تو انہوں نے بھائی جان کو سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔ شیخ صاحب اب مغلظات بک رہے تھے۔

"آپ کو بھائی جان سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔" ایک صاحب بولے۔ وہ عمر میں بھائی جان سے بھی کافی بڑے تھے۔

"ارے صاحب' میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ دنبے کی قربانی ہی کی تو بات کی تھی۔" شیخ صاحب نے تنک کر جواب دیا۔

"چندو دنبہ نہیں اور صرف باجی اور بھائی جان ہی کو نہیں' پورے محلے کو اولاد کی طرح عزیز ہے۔" ایک اور صاحب بولے۔

مگر شیخ صاحب اب بھی بپھرے ہوئے تھے۔ ایک جوان لڑکے نے سخت لہجے میں کہا "شیخ صاحب' اس طرح تو آپ یہاں نہیں رہ سکیں گے۔" اور محلے والوں نے اس کی بات پر یوں صاد کیا کہ اس کے بعد کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور سب اپنے اپنے گھر میں چلے گئے۔ شیخ صاحب گلی میں اکیلے کھڑے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

○

دونوں لڑکے بغیر کسی رکاوٹ اور دشواری کے باہر نکل آئے تھے۔ رات ہو چکی تھی مگر سڑکیں سنسان نہیں تھیں۔ بلکہ عید کی شاپنگ کرنے والوں کی وجہ سے عام دنوں کی نسبت زیادہ رونق تھی۔

اختر نے بغل میں دری دبائی تھی۔ اصغر کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دونوں چلے رہے۔ اس وقت وہ آزادی کی خوشی سے سرشار تھے۔ دوسرے جلد از جلد یتیم خانہ

کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ابھی انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کا کیا بنے گا۔

وہ چلتے رہے۔ انہیں اطمینان ہوگیا کہ یتیم خانہ بہت پیچھے رہ گیا ہے "لالٹین یہیں کہیں چھوڑ دے بھائی۔ کیا لٹکائے پھرے گا۔" اختر نے کہا۔

اصغر نے لالٹین سے پیچھا چھڑالیا لیکن دری ان کے بہت کام آسکتی تھی۔

اب ذرا سکون ہوا تو انہوں نے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ باہر نکلے ہوں۔ دو تین بار تو وہ مختلف تقریبات میں لے جائے گئے تھے۔ پھر دوبارہ یتیم خانے والوں نے کیمپ لگایا تھا تو وہ اس میں بھی بیٹھے تھے مگر بہرحال ان موقعوں پر وہ آزاد نہیں تھے جب کہ اس وقت وہ اپنے مالک آپ تھے۔

ابتدا میں تو وہ مزے سے گھومتے رہے۔ وہ اس وقت لالو کھیت کے علاقے میں تھے۔ وہ خریداری کرنے والوں کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ دنیا اتنی بڑی ہے۔ وہاں ان کی عمر کے بچے بھی تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بچے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ تھے۔

"مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ شہر میں اتنے لوگ رہتے ہیں۔" اصغر نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" اختر بولا "سب گھروں سے نکل آئیں تو چلا بھی نہیں جاسکتا۔"

"مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" اصغر ذرا دیر بعد منمنایا۔

یہ سنتے ہی اختر کی بھوک بھی جاگ اٹھی۔ دوپہر کے قریب چائے کے ساتھ پاپے کھائے تھے۔ اس کے بعد انہیں کچھ بھی نہیں ملا تھا "بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" وہ بولا۔

"کھانا کہاں سے ملے گا؟"

"ملنے کی جگہیں تو بہت ہیں مگر ہمارے پاس پیسے بھی تو نہیں ہیں۔"

"اسی لیے کہتا تھا' سوچ لے۔ یتیم خانے میں پتلی دال ملتی تھی مگر پیٹ تو بھر جاتا تھا۔"

"یہ سوچ کہ ہم زندہ ہیں۔ وہاں شاہ جی ہمیں مار ڈالتا۔"

"یہاں ہم بھوکے مر جائیں گے۔"

"نہیں مریں گے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" اختر نے کہا لیکن اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا۔

انہوں نے سڑک پار کی۔ سامنے ہی بکرا منڈی لگی تھی۔ وہاں دن کا سا سماں تھا۔ جانوروں کے بیوپاریوں نے جگہ جگہ گیس کی لالٹینیں جلائی ہوئی تھیں۔ وہاں ہجوم بھی بہت تھا۔ وہ اس ہجوم میں گھس گئے۔ وہاں جانوروں کے پیشاب اور گوبر کی بو بہت تیز تھی لیکن لوگ مزے سے خریداری کر رہے تھے۔

"نہیں بابو جی۔ گھر کا پلا ہوا جانور ہے۔ چار ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں کروں گا۔" مویشیوں کا ایک آڑھتی خریدار سے کہہ رہا تھا۔

خریدار نے جیب سے نوٹ نکالے اور گن کر آڑھتی کو دے دیے "بس اڑتیس سو سے اوپر نہیں دوں گا۔"

دونوں لڑکوں نے زندگی میں صرف ایک بار پانچ کا ایک نوٹ دیکھا تھا.... وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ یتیم خانے میں عید میلادالنبیؐ کا جلسہ ہوا تھا۔ اس میں ایک بڑا سیٹھ مہمان آیا تھا۔ اس نے سب بچوں کو پانچ پانچ کا ایک نوٹ دیا تھا۔ وہ دونوں اس نوٹ کو پڑھتے رہے تھے۔ ایک ایک لفظ .... بینک دولت پاکستان .... پانچ روپے اور پھر عین اس وقت جب وہ یہ سوچنا شروع کر رہے تھے کہ اس سے کیا کیا خریدیں گے' ان سے نوٹ چھین لیے گئے تھے۔

اختر کو وہ نوٹ یاد آیا پھر خیال آیا کہ کھانا پیسوں سے ملتا ہے۔ اس نے بڑی لجاجت سے خریدار سے کہا "ایک نوٹ ہمیں دے دیں صاحب۔"

خریدار نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا "دماغ خراب ہے۔ سو روپے دے دوں۔"

آڑھتی نے ان دونوں پر آنکھیں نکالیں "بھاگو یہاں سے .... ورنہ پھینٹی لگاؤں گا۔ سالا' زندا خراب کرتے ہو۔"

"ہم بھوکے ہیں۔" اختر نے کہا لیکن آڑھتی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ واقعی مرمت کر دے گا۔ وہ اصغر کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ بکرا منڈی میں ہی گھوم رہے تھے۔ اختر جانوروں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا "تجھے پتا ہے' یہ سب جانور بک جائیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔" اس نے اصغر سے کہا۔

"اور سب کی قربانی ہوگی۔" اصغر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "کتنا گوشت نکلے گا ان میں سے۔"

اتنا کہ پورا شہر.... ایک ایک بچہ جی بھر کے کھالے۔ پھر بھی بچ جائے گا۔" اختر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"ہمیں بھی ملے گا نا؟"

"ہاں۔" اختر نے عالمانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"بقر عید کے دنوں میں ہر شخص کو گوشت ملتا ہے۔" پھر اس نے توقف کیا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی ایک بکری پکڑ کر کھا جاؤں .... کچا ہی کھا جاؤں۔"

"تیرے گوشت کے شوق نے ہی تو مصیبت میں پھنسایا ہے۔" اصغر جھنجلا گیا۔

"سچ کہتا ہوں' ایک بار جی بھر کے گوشت کھالوں' پھر کبھی گوشت کی ضد نہیں کروں گا۔"

وہ یوں ہی گھوم رہے تھے کہ ایک پولیس والے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ زمین نے جیسے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اختر نے حوصلہ افزائی کے انداز میں سرہلایا۔ دونوں وہیں کھڑے پولیس والے کی آڑھتی سے گفتگو سنتے رہے۔

"سر جی' یہ تو بڑی زیادتی ہے جناب۔" آڑھتی فریاد کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا "پانچ ہزار میں سات بکرے اس موسم میں کہاں ملتے ہیں۔ چلو' میں کر بھی دوں مگر آپ کہتے ہو کہ جانور بھی اچھا اور تگڑا ہو۔"

"تم جانتے ہو' میں نے کبھی تم لوگوں کو تنگ نہیں کیا۔" پولیس والے نے عاجزی سے کہا۔

"وہی تو میں حیران ہوں انسپکٹر صاحب! آپ تو بندے ہی اور طرح کے ہو۔ ہم خوشی سے بھی کچھ دیں تو آپ نہیں لیتے ہو۔"

"یہ اوپر والے کا معاملہ ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے' قربانی ...."

"میں سب کے اوپر والے کی نہیں' اپنے اوپر والے کی بات کر رہا ہوں۔" انسپکٹر کا لہجہ تلخ ہوگیا "اس نے پانچ ہزار مجھے دیے اور بولا' مجھے سات اچھے اور تگڑے بکرے چاہئیں۔ بس کل تک لا دو۔ میں نے کہا کہ سر' یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ بولا' بکرا منڈی تو تمہارے ہی علاقے میں لگتی ہے۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ وہ تو کچھ نہیں سنے گا۔"

آڑھتی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "پانچ ہزار میں تو بات بننی مشکل ہے سر جی۔"

"میں کیا کروں۔ میں تو غلط کام کرتا نہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو صاحب سے پانچ ہزار بھی نہ لیتا۔ اور بنگلے پر سات بکرے بھی پہنچا دیتا۔ میرے پاس کچھ ہوتا تو میں رقم بڑھا سکتا تھا۔"

آڑھتی نے اس بار ذرا زیادہ سوچا "پر سات بکروں کا وہ کیا کریں گے سر جی؟"

"ارے .... ملنے والوں کی' رشتے داروں کی فرمائشیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

"ایسی قربانی قبول ہو جائے گی انسپکٹر صاحب؟"

"یہ اوپر والا جانے۔" انسپکٹر نے دکھ سے کہا "یہ تو قربانی کرنے والوں کو سوچنا چاہیے۔"

آڑھتی نے اس بار اور زیادہ سوچ بچار کیا "اب آپ کی بات ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا سر جی...."

"میری خاطر مت کرو۔" انسپکٹر نے تلخی سے کہا "اپنی سوچو۔ میرا صاحب اس علاقے کا انچارج ہے۔ میرا تو صرف ٹرانسفر ہوگا اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ مال پانی تو کماتا نہیں ہوں کہ فکر کروں۔ ہاں وہ تمہیں بہت تنگ کریں گے۔ تمہارا دھندا خراب ہوگا۔"

"ٹھیک ہے سر جی۔ میں دوسروں سے بات کرتا ہوں۔ بڑی منڈی ہے۔ ہمیں مل جل کر ہی یہ بوجھ اٹھانا ہوگا۔ آپ رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اختر اور اصغر آگے بڑھ گئے۔ دونوں کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ منڈی سے

نکلے اور الکرم اسکوائر کی طرف چل دیے۔ بلڈنگ کے باہر ہی ایک بڑا ریسٹورنٹ تھا۔ باہر بڑا سا توا چڑھا تھا اور کٹاکٹ بنایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ تکے کباب اور بوٹیاں سیخ پر بھونی جا رہی تھیں۔ وہ دھواں اور گوشت کی وہ خوشبو پاگل کر دینے والی تھی۔ دونوں اس طرف بڑھ گئے اور دیر تک بھنتے ہوئے گوشت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اختر کے تو حلق میں گولے سے پھنس رہے تھے۔ منہ میں پانی بھرتا اور وہ اسے نگلنے کی کوشش کرتا تو حلق دکھنے لگتا۔

"بڑی بھوک لگی ہے۔" اصغر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مگر اپنے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔"

"میں کچھ کرتا ہوں۔ آ میرے ساتھ۔"

وہ دونوں ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے۔ دروازے کے پاس ہی کاؤنٹر تھا۔ اختر اسے وہاں لے گیا "سیٹھ .... ہم بہت بھوکے ہیں۔" اختر نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے شخص سے فریاد کی۔ "ہمیں کھانا کھلا دو۔"

"پیسے ہیں تمہارے پاس؟" سیٹھ نے انہیں ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیسے ہوتے تو تم سے کیوں کہتے سیٹھ۔ اندر جاکر بیٹھتے اور کھانا منگا لیتے۔"

سیٹھ کی تیوریاں چڑھ گئیں "زبان کا تیز معلوم ہوتا ہے تو۔ ابے بھیک ایسے مانگتے ہیں۔"

اصغر نے جلدی سے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے "ہم بھکاری نہیں ہیں سیٹھ، یتیم ہیں۔" اس نے بے حد عاجزی سے کہا۔

سیٹھ نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا "او فضلو!" اس نے بیرے کو آواز دی "ان بچوں کو دال اور روٹی لاکر دے جلدی سے۔"

"سیٹھ میں گوشت کھاؤں گا۔" اختر نے کہا۔

"ابے، ہوش میں تو ہے۔" اس بار سیٹھ کو غصہ آگیا "کھانا ہے تو کھا۔ نہیں تو راستہ ناپ۔"

"سیٹھ اتنا گوشت ہے۔ مجھے تھوڑا سا دے دو گے تو تمہارا کیا جائے گا۔" اختر

نے عاجزی سے کہا "تمہیں اللہ بہت دے گا۔ مجھے خوش کر دو۔"

سیٹھ دل کا برا بھی نہیں تھا۔ وہ انہیں گوشت بھی کھلا دیتا لیکن اختر سے وہ چڑ گیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی تھی ہی چڑا دینے والی۔ پہلا تاثر ہی خراب ہوگیا تھا "تو گوشت کا حساب کتاب نہ کر۔ دال کھانی ہے تو بتا ورنہ کوئی اور دروازہ دیکھ۔" سیٹھ نے رکھائی سے کہا۔

"شکریہ سیٹھ لیکن میں دال نہیں کھاؤں گا۔"

اتنی دیر میں فضلو ایک پلیٹ میں دال اور چند روٹیاں لے آیا تھا۔ سیٹھ نے کہا "واپس لے جا بھئی۔ ان لوگوں کے تو نخرے ہیں۔ کسی بڑے گھر کے بھکاری لگتے ہیں۔ پیٹ بھرے ہیں شاید۔"

فضلو واپس جانے کے لئے پلٹا بھی نہیں تھا کہ اصغر نے جلدی سے کہا "مجھے تو جو مل جائے گا' کھالوں گا سیٹھ"

سیٹھ نے کہا "ٹھیک ہے فضلو! یہ کھانا اس لڑکے کو دے دے۔"

اصغر باہر زمین پر بیٹھ گیا "تو بھی آجا یار۔ ضد نہ کر۔" اس نے اختر سے کہا۔

اختر نے اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا "اگر دال کھانی ہوتی تو اتنی مار کیوں کھاتا۔ یوں دربدر کیوں پھرتا تو کھالے۔"

اصغر کو مایوسی ہوئی لیکن اس کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے سیٹھ نے کن انکھیوں سے اختر کو دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے اپنے ساتھی کو کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق کا کنٹھا بار بار گردش کر رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس کے منہ میں پانی بھرا آرہا ہے' جسے وہ بار بار نگل رہا ہے۔ یہ بات طے تھی کہ لڑکا بہت بھوکا تھا۔ سیٹھ کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے تھوڑا سا گوشت دلوا دے۔

"کچھ فائدہ نہیں۔ عادت ہی بگڑے گی سالے کی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اسٹائل تو دیکھو۔ دھونس جماتا ہے سالا۔ میں تو گوشت کھاؤں گا۔ جیسے اپنے باپ کے گھر میں بیٹھا ہو۔" اس نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔

○

Rehan
http://www.rehanahmeds.com
Ahmed

باجی کو حیرت ہوئی کہ چندو اکیلا واپس آیا ہے" تیرے ابو کہاں ہیں رے چندو؟" انہوں نے پوچھا۔

چندو جواب نہیں دے سکتا تھا مگر اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے شیڈ میں چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ جگالی کرنے لگا۔ باجی کو جو تشویش تھی وہ دور ہوگئی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو چندو یوں سکون سے آکر نہ بیٹھتا۔ انہوں نے جاکر چائے کا پانی رکھ دیا۔

پانچ منٹ بعد بھائی جان گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے کو ایک نظر دیکھ کر باجی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ غصے میں ہیں۔

بھائی جان کمرے میں چلے گئے۔ باجی نے چائے نکالی اور دونوں پیالیاں چھوٹی ٹرے پر رکھ کر کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے چائے کی پیالی شوہر کو دیتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ غصہ کیوں آرہا ہے آپ کو..... اور کس پر آرہا ہے؟"

بھائی جان نے چونک کر انہیں دیکھا "نہیں..... غصہ تو نہیں آرہا ہے۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

"مجھ سے آپ کچھ نہیں چھپا سکتے۔" باجی مسکرائیں۔

"آپ بھی مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔ آج آپ پریشان ہیں؟"

"نہیں لیکن صبح سے جھنجلا رہی ہوں۔"

"کوئی وجہ بھی ہوگی؟"

"ہے۔ بتا بھی دوں گی مگر پہلے آپ بتائیں۔"

بھائی جان نے انہیں پورا واقعہ سنایا پھر بولے "میں تو اس کا سر پھاڑ دیتا۔ بڑا آیا شیخ کہیں کا۔"

"پھر بھی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" باجی نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

"کیسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ میں نے کیا کیا ہے؟" بھائی جان جھنجلا گئے۔

"آپ کو اس کے بچے کے متعلق ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بری بات ہے۔"

"یہ بات آپ کہہ رہی ہیں۔" بھائی جان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ دیکھیں نا' دنیا میں سب سے بڑی محبت اولاد کی ہوتی ہے۔ سب سے عزیز چیز اولاد ہوتی ہے۔" باجی کی سماعت میں نعمت کی باتیں گونج رہی تھیں۔

"تو چندو ہماری اولاد نہیں ..... ہمارا بیٹا نہیں۔"

"ہے۔ لیکن دوسرے اس بات کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تو یہی کہیں گے۔" باجی نے آہ سرد بھر کے کہا "آج کسی اور نے بھی مجھ سے یہی بات کی .... مذاق میں نہیں۔ بہت سنجیدگی اور خلوص سے۔"

"کس نے ....؟"

"نعمت نے اور میں اس پر خفا ہوئی مگر میں نے اس کے بچوں کو کچھ نہیں کہا۔"

"کیوں؟ جب کہ آپ چندو کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔"

"میں آپ سے زیادہ چاہتی ہوں اسے لیکن عورت حقیقت پسند ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ چندو میرا بیٹا ہے ..... مگر دنبہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے' جو بدل نہیں سکتی اور دوسرے تو اسے دنبہ سمجھ کر ہی بات کریں گے۔ کتنی ہی تکلیف دہ سہی' مگر ان کی بات ناروا نہیں۔ دیکھیں نا' کوئی کسی دشمن کی اولاد کے لئے بھی ایسے نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے اسے دنبہ ہی سمجھ کر تو کہا۔ وہ ہمارا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتے۔ حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔"

"میں تو خون پی جاؤں ایسا کہنے والے کا۔" بھائی جان بپھر گئے۔

اس لیے کہ آپ حقیقت پسند نہیں۔ آپ کی محبت میں گہرائی نہیں۔ آپ چندو کو دنبہ نہیں' اپنا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔ جس لمحے آپ اسے دنبہ تسلیم کرلیں گے' اسے بیٹا سمجھنا چھوڑ دیں گے .... اور آپ کی محبت بھی کم ہو جائے گی۔"

آپ کا اسٹوڈنٹ

"بس شمسہ بیگم! نہ آپ اب کی یاد آ اس وقت کلاس میں ہیں۔ نہ میں آپ کا اسٹوڈنٹ

ں۔" بھائی جان ہنس دیے۔ ہے' اللہ۔

باجی بھی ہنس دیں۔ مدے کا عاجز دل کا غبار نکل گیا تھا۔ دونوں ہلکے پھلکے ہو گئے۔ دونوں

ے سوچا.... کہنے دو۔ کس کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

○

ان کی طرف

کہ میرا گوشہ

کھانے لگے مجھے گوشت بعد دونوں لڑکے پھر چل دیے۔ ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ انہیں

یہ بھی نہیں معلوم ہیں دیتا۔ آپ اتھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ دونوں خاموش تھے

.... اور دونوں بقر عید آرہی ں خاموشی کا سبب شرمندگی تھی۔ اصغر شرمندہ تھا کہ بھوک نے اسے

.... خود غرض بچہ میں بھی تڑپا دیا۔ اس نے اکیلے ہی اکیلے کھانا کھالیا جب کہ اختر بھوکا ہے۔ اختر کو

یہ شرمندگی دعا کرتا رہا.... ئی کہ وہ اصغر کو یتیم خانے سے نکال لایا ہے اور اب سونے کا ٹھکانا بھی

نہیں۔ اب ۔ اچانک ہی ا اصغر کہے گا کہ نیند آرہی ہے تو وہ کیا کرے گا۔ اس شرمندگی سے اختر کو

ایک بہت بڑہ سو گیا۔ خواب بڑا فائدہ ہوا تھا۔ وہ اپنی بھوک بھول گیا تھا۔

دو ت تھا۔ سچ کہا دل بہت سارے بچوں کے درمیان سونے کے عادی تھے۔ اور یہ وہ رات

تھی' جب ۔ خوب سیر ہو ان کے سر پر چھت نہیں' نیلا آسمان تھا۔ انہیں اگر سونا تھا تو تنہا ہی سونا

تھا۔ اب ۔ تک سونے کے لئے انہیں فٹ پاتھ کے سوا کوئی جگہ نظر نہیں آئی تھی مگر

روشن۔ اس لیے کسی سے روشن فٹ پاتھ بھی انہیں اندھیرا ہی لگا تھا۔ جب کہ وہ خوب تیز روشنی

میں سو نکل گیا۔ وہ ایک سا چاہتا تھا۔

اصغر بھی اٹھ دور سے اسے بہت تیز روشنی نظر آئی۔ روشنی خاصی بلندی پر تھی اور ان کے

انداز۔ سخت لہجے میں پوے سے کافی دور تھی۔ وہ اس طرف بڑھتے رہے۔ وہ اب تک بہت زیادہ پیدل

چل۔ اصغر کے ہونٹ چکے تھے۔ تھکن سے ان کا برا حال تھا۔ خاص طور پر اختر کی حالت بہت ابتر

تھی۔ گہری نیند سے اٹھ پہلے تو اتنی مار اور اس کے نتیجے میں جسمانی اذیت۔ پھر دیوار توڑنے کی مشقت

اور ا۔ "بولتے کیوں نہ یہ پیدل چلنا۔ اب تو اس کے زخموں اور چوٹوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"ہم سو رہے وہ روشنیاں عائشہ منزل کی چورنگی کی تھیں۔ قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا

روش "وہ تو میں بھی نیاں ایک چھوٹے سے پارک کے بیچ میں نصب ہیں۔ وہاں ایک فوارہ بھی چل

تھا۔ وہ مسحور ہو کر رہ گئے۔ "بس ہم یہاں سوئیں گے۔" اختر نے خوش ہو کر کہا۔
"ٹھیک ہے۔" اصغر نے تائید کی۔ وہ بھی خوش نظر آرہا تھا۔ رات کافی ہو چکی
تھی۔ شاپنگ سینٹرز پر تو اب بھی رش ہوگا مگر اس سڑک پر بھاڑ پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا اور
راہ گیر تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے سڑک پار کی اور اس چھوٹے سے گول
پارک میں گھس گئے۔ روشنی انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حیرت مگر اسی لمحے فوارہ بند
ہوگیا۔

"یہاں سوئیں گے۔ کیسا مزہ آئے گا۔" اختر نے کہا۔
"واقعی ....." اصغر نے تائید کی "گھاس کیسی اچھی لگ رہی ہے .... ٹھنڈی
ٹھنڈی۔"

دونوں ننگے پاؤں تھے اور خوب پیدل چلے تھے۔ ان کے تلوے بری طرح جل
رہے تھے۔ ایسے میں گھاس کی ٹھنڈک ان کیلئے بہت بڑی نعمت تھی۔ ادھر سے ادھر
گھاس پر چکر لگاتے رہے۔ وہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ وہ پارک میں تھا۔ چھوٹی
سی چورنگی تھی، جہاں گھاس لگا کر درمیان میں فوارہ لگا دیا گیا تھا۔
"بس یہاں دری بچھائیں گے اور سو جائیں گے۔" اختر نے کہا۔
"دری بچھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" اصغر بولا "گھاس پر ہی سو جائیں
گے۔"

"کیا پتا، کیڑے مکوڑے ہوں۔ دری بچھانا ہی ٹھیک ہے۔"
انہوں نے دری بچھائی اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اصغر تو فوراً ہی سو گیا
لیکن اختر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے لئے رات آسان نہیں ہے۔ جسم کی چوٹیں اور
اذیتیں، مشقت کی دکھن اور پھر آج کا پیدل چلنا۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا
تھا مگر پھر بھوک نے ہر تکلیف کا احساس مٹا دیا۔ پیٹ میں جیسے کوئی جانور گھسا بیٹھا
تھا، جو اپنے تیز پنجوں سے جسم کی دیوار کو کھرچ رہا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں
پچھتاوا ابھرا۔ اگر وہ بھی اصغر کے ساتھ بیٹھ کر کھالیتا تو .... مگر فوراً ہی ضد نے اس
پچھتاوے کو مٹا دیا۔ گوشت کی خاطر اس نے اتنی اذیت جھیلی تھی۔ اب وہ اس پر
سمجھوتا کیسے کرتا۔

اسے پہلے مولوی صاحب کی یاد آئی اور پھر اللہ میاں کا خیال آیا۔ مولوی صاحب کہتے تھے .... جو مانگنا ہے' اللہ سے مانگا کرو۔ وہ سب کچھ دیتا ہے۔ کل جہانوں کا مالک ہے اور اسے بندے کا عاجزی سے مانگنا بہت پسند ہے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔

اس نے آسمان کی طرف منہ کیا اور بڑبڑایا "پیارے اللہ میاں' دیکھیے ..... آپ تو جانتے ہیں کہ میرا گوشت کھانے کو کیسا جی چاہتا تھا۔ میں نے گوشت مانگا تو کیا برا کیا۔ شاہ جی مجھے گوشت دے سکتا تھا لیکن نہیں دیا۔ الٹا مجھے مارا۔ اب مجھے کوئی بھی گوشت نہیں دیتا۔ آپ مجھے گوشت بھیج دیں۔ میں بہت شکر ادا کروں گا۔ دیکھیں ..... اب تو بقر عید آرہی ہے۔ مجھے خوب سارا گوشت ملنا چاہیے۔ اتنا کہ میں جی بھر کے کھاؤں پھر میں کبھی پتلی دال سے بھی انکار نہیں کروں گا۔"

وہ دعا کرتا رہا ..... دعا کیا' وہ تو اللہ میاں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ یہی سب کچھ دہراتا رہا۔ اچانک ہی اس کے پیٹ کی بے قراری کو جیسے قرار آگیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ سوگیا۔ خواب میں اس نے خود کو ایک ایسے دستر خوان پر پایا' جہاں گوشت ہی گوشت تھا۔ سیخ کباب' بوٹیاں' بھنا ہوا قیمہ' بھنا ہوا گوشت اور وہ جی بھر کے کھا رہا تھا۔ خوب سیر ہوکے کھانے کے بعد اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

اس لمحے کسی نے جھنجوڑ کر اسے جگایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا دم نکل گیا۔ وہ ایک پولیس والا تھا اور وہ ان دونوں کو باری باری جھنجوڑ رہا تھا۔

اصغر بھی اٹھ بیٹھا "کیوں بھئی' تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟" پولیس والے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اصغر کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔ وہ تو ویسے بھی ڈرپوک تھا اور اس وقت گہری نیند سے اٹھا تھا۔

"بولتے کیوں نہیں۔"

"ہم سو رہے ہیں جی۔" اختر نے دل کڑا کر کے کہا۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر یہاں کیوں سو رہے ہو؟"

"فٹ پاتھ پر اندھیرا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ابے آلو' میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔" پولیس والے نے کہا "کیا گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"ہمارا گھر نہیں ہے جی۔" "مگر اس سے پہلے کہیں تو رہتے ہو گے؟"

اختر جھوٹ گھڑنے والا تھا پھر نجانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا "ہم یتیم خانے میں تھے جناب۔"

"تو یتیم خانے سے بھاگے ہو۔ کیوں؟"

اختر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ پولیس والا بڑے غور سے سنتا رہا پھر سر ہلا کر بولا "ہم پولیس والے تو بدنام ہیں۔ تمہارے شاہ جی جیسے لٹیروں کی یہاں عزت ہوتی ہے۔ انہیں سوشل ورکر کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ وہ ہمارے مقابلے میں بہت بڑے مجرم ہیں مگر انہیں تو حکومت سے تمغا ملتا ہے۔ ہم پبلک کی گالیاں بھی کھاتے ہیں اور حکومت کی بھی۔ کیسا اندھیر ہے۔ حرامی کہیں کے .... یتیموں کا مال بھی کھا جاتے ہیں اور ظلم الگ توڑتے ہیں۔"

اختر کو نہ تو سوشل ورکر کا مطلب معلوم تھا۔ نہ ہی اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی تھی۔ پولیس والے کی باتوں سے اصغر کا بھی حوصلہ بڑھا۔ اس نے کہا "اس اختر نے پورے دن کچھ نہیں کھایا ہے انسپکٹر صاحب!"

پولیس والا ہنسنے لگا "میں انسپکٹر نہیں ہوں پگلے۔ میں تو معمولی کانسٹیبل ہوں۔" پھر وہ اختر کی طرف مڑا "ایسی ضد کرکے اپنی جان پر ظلم نہیں کرتے بیٹے۔ کل جو بھی ملے' کھا لینا۔ پرسوں بقر عید ہے۔ گوشت مل ہی جائے گا۔"

"میں نے تو اللہ میاں سے گوشت مانگ لیا ہے کانسٹیبل صاحب! وہ مجھے دے دیں گے۔"

"اللہ تو اپنے بندوں کو وسیلہ بناتا ہے مگر آج کل بندوں کے دل بہت سخت ہوگئے ہیں۔" پولیس والے نے سرد آہ بھر کر کہا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا اور اصغر کو دیا۔ "اس وقت تو میرے پاس یہی ہے۔ رکھ لو۔ صبح ناشتا پانی کرلینا۔"

"شکریہ کانسٹیبل صاحب!"

"مگر آج کل یہاں سونا خطرے سے خالی نہیں۔" کانسٹیبل بولا۔

"کیوں......؟"

"دہشت گردی کی وجہ سے۔ دہشت گرد کسی کو بھی نہیں بخشتے۔ خیر صبح چھ بجے تک تو میری ڈیوٹی ہے۔ میں تمہارا خیال رکھوں گا۔ سو جاؤ لیکن سنو' تم ہمیشہ تو یہاں نہیں سو سکتے۔ کیا کرو گے آگے؟"

لڑکے ٹکر ٹکر اسے دیکھتے رہے۔ وہ خود اس سوال کا جواب تلاش کر رہے تھے مگر وہ مل نہیں رہا تھا۔

"ایسا کرو' عید کی تیسری رات مجھے یہیں ملنا۔ میں تمہیں ایک ہوٹل میں رکھوا دوں گا۔ اس کا مالک میرا جاننے والا ہے۔"

"شکریہ کانسٹیبل صاحب!"

پولیس والا چلا گیا۔ اصغر سو گیا مگر اختر کو نیند نہیں آئی۔ حالانکہ .... اب بھوک اسے نہیں ستا رہی تھی۔ جیسے گوشت کھانے کا وہ خواب' خواب نہیں' حقیقت ہو۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے بھی نیند آ گئی۔

Rehan Ahmed http://www.rehanahmeds.com

چندو بے خبر سو رہا تھا لیکن باجی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ ان کے شوہر بھی جاگ رہے ہیں "کیا بات ہے۔ آپ سوئے نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نیند نہیں آرہی ہے۔" بھائی جان نے جواب دیا۔

"کیوں بھئی۔ سر میں تیل لگا دوں؟"

"ارے نہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دراصل بے فکری ہے نا۔ صبح دفتر میں تو جانا نہیں ہے۔ اطمینان سے دیر تک سوؤں گا۔"

پریشانی کی بات تو ہے۔؟ باجی کے لہجے میں تشویش تھی "بنا بنایا معمول خراب نہیں ہونا چاہیے۔ جو ایک دن ہو سکتا ہے، وہ کسی بھی دن ہو سکتا ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ ابھی سو جاؤں گا ذرا دیر میں۔"

باجی جانتی تھیں کہ وہ ابھی تک شیخ صاحب کی بات پر جل کڑھ رہے ہیں۔ وہ تیل کی شیشی لائیں اور شوہر کے سر میں تیل ملنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ذکریا صاحب کو نیند آگئی۔ وہ سو گئے لیکن باجی کی آنکھوں میں اب بھی نیند نہیں تھی۔

○

شبیر شاہ کو اختر کی طرف سے پریشانی تھی۔ وہ اس سلسلے میں غور کرتے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس طرح انہوں نے اختر کو مارا ہے، کوئی اور ہوتا اس کی جگہ تو ہمیشہ کے لئے سیدھا ہو جاتا لیکن اس لڑکے کی اکڑ دیکھو۔ پٹنے کے دوران اس نے اف بھی نہیں کی۔ معافی تک نہیں مانگی۔ یہ کیسی گوشت کی خواہش ہے؟

بہت ڈھیٹ ہے۔ انہوں نے غصے اور نفرت سے سوچا۔ ضرور کسی حرامی کی

رام کی اولاد ہو گا۔

انہوں نے آواز دے کر اسلام الدین کو بلایا۔ وہ آیا تو انہوں نے پوچھا "اس رام زادے اختر کا کیا حال ہے؟"

"کیا پتا شاہ صاحب۔ آپ کے حکم کے مطابق اسے کوٹھری میں اکیلا پھینک دیا گیا ہے۔"

"ارے تو کسی نے اس کی خبر بھی نہیں لی؟"

"آپ نے منع کیا تھا جناب عالی۔"

"وہ تو بہت زخمی تھا۔ کہیں مر ہی نہ گیا ہو۔"

"یہ حرامی بہت سخت جان ہوتے ہیں شاہ صاحب۔"

"اچھا چل، مجھے نہ پڑھایا کر۔" شاہ صاحب نے غصے سے کہا۔ "جا نظام کو بلا کر لے آ۔"

اسلام الدین چلا گیا۔ شاہ صاحب سوچ رہے تھے کہ جو کچھ انہوں نے سوچا ہے، اس سے کم سے کم لوگ واقف ہوں تو بہتر ہے۔ اسلام الدین کو بھی بے خبر ہی رہنا چاہیے۔ بس بات ان کے اور نظام کے درمیان ہی رہے۔

اختر کو مارنے کے بعد سے وہ اس سلسلے میں غور کر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اختر کو منظور نظر لوگوں میں شامل کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب کہ شامل نہ کرنے میں وہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بس ایک رکاوٹ تھی ان کے ذہن میں۔ یہ سمجھوتا تھا اور انہیں کمزوری کے احساس میں مبتلا کرتا تھا۔ پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ کیا اس طرح ہر کس و ناکس انہیں بلیک میل کرے گا۔

"یہاں عقل کے بجائے جذبات سے کام لیا تو یہ اختر اپنی سوچ، اپنی زبان سے پورے یتیم خانے کو دے دے گا۔" انہوں نے خود کو سمجھایا "پھر سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

چناں چہ انہوں نے حتمی فیصلہ کر لیا۔ نظام آیا تو انہوں نے اس سے اختر کے متعلق پوچھا۔ نظام نے بھی وہی جواب دیا، جو اسلام الدین نے دیا تھا "ارے ..... وہ تو کل ہی غصے میں تھا ورنہ وہ تو بچہ ہے اور پھر یتیم بچہ۔ مجھے تو اپنی زیادتی کا شدید احساس

ہو رہا ہے۔ اس شام سے اب تک نہ میں ٹھیک طرح سے سو سکا ہوں۔ نہ میں نے ڈھنگ سے کھانا کھایا ہے۔" شاہ صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نظام نے شاہ صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ نیند کے بارے میں تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے چار تندروی روٹیوں کے ساتھ آدھا کلو بھنا ہوا گوشت سونتا تھا۔

"دیکھو نظام' اب جو بات میں کہہ رہا ہوں' وہ میرے اور تیرے درمیان ہی رہے۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ صاحب۔"

"جو کچھ تو کھائے' وہی اختر کو دے دیا کر مگر سب سے چھپا کر۔ سمجھ گیا۔؟"

"سمجھ گیا شاہ صاحب۔"

"اور فیضو کے ساتھ جاکر اختر کو کوٹھری سے نکال لا۔ اس کی دوا دارو بھی کر۔ یتیم بچہ ہے۔ دعا دے گا۔ اللہ نے یتیموں کے ساتھ نرمی کا حکم دیا ہے۔"

بید مار مار کر غریب کی کھال ادھیڑ دی اور اب اللہ کا حکم یاد دلاتا ہے ڈرامے۔ نظام نے دل ہی دل میں کہا پھر زبان سے بولا۔ "جی شاہ صاحب! یہ فرمائیں کہ اسے آپ کے پاس لاؤں یا نہیں۔"

"نہیں۔ مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جائے گی۔" شاہ صاحب نے کہا "بس اب تو جا۔"

○

یتیم خانے میں کھانا کھایا جا چکا تو فیضو کوٹھری کی طرف گیا۔ اس نے تالا کھول کر دیکھا تو ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آئی۔ دونوں لڑکے غائب تھے۔ وہ مسکرایا۔ اسے لڑکوں کی عقل مندی میں کوئی شبہ نہ تھا مگر اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنے عقل مند ثابت ہوں گے۔ فرار ہوتے وقت انہیں اس کا خیال تھا۔ لہٰذا کدال' دری اور لالٹین سب غائب تھیں۔ وہ برتن وہ البتہ چھوڑ گئے تھے' جن میں وہ گرم پانی اور ہلدی کا

لیپ لایا تھا۔ کدال کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہ موجود ہوتی تو اسے کہانی گھڑنا پڑتی۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اس نے دونوں برتن اٹھائے' کوٹھری کو تالا لگایا اور واپس چل دیا۔ برتن اس نے دھو دھلا کر کچن میں رکھ دیے۔ پھر وہ ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد نظام اس کے پاس آیا "فیضو.... چل کر کوٹھری کھول۔"

"کیوں؟"

"اختر کو نکالنا ہے۔ یہ شاہ صاحب کا حکم ہے۔"

"خیر تو ہے۔ کیا پھر ماریں گے اسے؟"

"نہیں۔" نظام مسکرایا "شاہ جی نے اسے ہم میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب جو ہم کھائیں گے' وہ اسے بھی دیں گے لیکن چپکے سے۔" وہ کہتے کہتے رکا اور فیضو کو بہت غور سے دیکھا۔ "سن .... یہ بات بس تیرے اور میرے درمیان ہے۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

فیضو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ نظام کو لے کر کوٹھری کی طرف چل دیا۔

کوٹھری کا منظر دیکھ کر نظام کو سکتہ ہوگیا۔ فیضو نے بھی اداکاری کی "ارے .... یہ کیا۔ وہ دونوں کہاں گئے؟"

"ابے وہ اتنا بڑا سوراخ نظر نہیں آرہا ہے۔ ایسے گئے۔" نظام نے بھنا کر کہا "مگر ہوا کیسے؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔ میں تو ایک بار ہلدی اور گرم پانی لایا تھا پھر دوسری بار آیا تو اصغر کو یہاں سے لے گیا اور برتن بھی لے گیا۔ اس کے بعد سے تو میں اب آیا ہوں۔"

"تو نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔ تجھے تو بڑی فکر تھی اس کی۔" نظام نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی کا حکم اتنا سخت تھا۔ مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی اس کی دیکھ بھال کی۔"

"مگر یہ دیوار اس نے توڑی کیسے؟"

"یہ باہر کا کام ہے۔ پہلے چل کر اصغر کو دیکھو پھر بتاؤں گا۔"

انہوں نے جاکر چیک کیا تو اصغر موجود نہیں تھا "وہ کہیں سے کدال لے گیا ہوگا اور دیوار توڑی ہوگی۔" فیضو نے کہا۔

نظام بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

"دونوں بڑے پکے دوست تھے۔" فیضو نے وضاحت کی۔

"اب تو ہی شاہ جی کے سامنے جواب دینا۔ وہ تیری ذمے داری تھے۔"

"تو میں ڈرتا ہوں کیا۔" فیضو نے سینہ تان کر کہا "ڈروں تو جب کہ میں چور ہوں۔" "لیکن مجھے لگتا ہے کہ تو اس کے پاس جاتا رہا ہے۔" نظام نے کہا پھر رازداری کے انداز میں بولا "ہلدی تو تو مجھ سے ہی لے کر گیا تھا۔"

"مگر میں یہ بات شاہ جی کو نہیں بتا سکتا۔ تو میرا دوست ہے۔" فیضو کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"تو شاہ جی کو یہ پتا کیسے چلے گا۔ بس تو جانتا ہے اور میں جانتا ہوں۔" نظام سیدھا ہوگیا "چل شاہ جی کے پاس۔"

○

شبیر شاہ تو دونوں لڑکوں کے فرار کی خبر سن کر آپے سے باہر ہوگئے "میں نے اسے تیری ذمے داری بنایا تھا۔ انہوں نے فیضو پر آنکھیں نکالیں۔

"تو شاہ جی، میں نے تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔" فیضو نے مسمسی سی شکل بنا کر کہا۔

"تو نے خبر تک نہیں لی اس معصوم کی۔"

"آپ کا حکم تھا شاہ جی!"

"وہ میں نے غصے میں دیا تھا۔"

"اور کیا۔" نظام نے ٹکڑا لگایا "شاہ جی سے تو اس کے غم میں سویا جا رہا ہے نہ کھانا کھایا جا رہا ہے۔"

شاہ جی نے اسے گھور کر دیکھا مگر بات آگے نہیں بڑھائی۔ "حیرت ہے، وہ نکل

کیسے گئے۔"

"بہت تیز لڑکے تھے شاہ جی!" فیضو بولا "اصغر نے اسٹور سے کدال نکالی اور کام دکھا دیا۔"

"مجھے یہ بات اتنی سادہ نہیں لگتی۔ خیر۔۔۔" شاہ جی نے گہری سانس لی "کچھ بھی ہو' انہیں ڈھونڈ کر لانا ہے۔"

"ہونا تو یہی چاہیے شاہ جی۔ واپس آئیں تو مار مار کے کھال گرا دیجئے گا سسروں کی۔

"بے وقوف' میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔" شاہ جی نے غصے سے کہا "ہم انہیں پہلے سے زیادہ اچھا رکھیں گے۔ مجھے تو دکھ اس بات کا ہے کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگتے پھریں گے کم بخت۔ بدنامی ہماری ہوگی۔ میری ایک ساکھ ہے شہر میں۔ ہم کتنے ہی خراب سہی۔ ہم نے بھیک نہیں منگوائی اپنے بچوں سے۔ بے چارے ...." شاہ جی پر رقت طاری ہونے لگی "فیضو ..... انہیں واپس لانا بھی تیری ذمے داری ہے۔"

فیضو ہکا بکا رہ گیا "یہ کیسے ممکن ہے شاہ جی! آپ سوچیں تو میں اتنے بڑے شہر میں انہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔"

شاہ جی نے چند لمحے سوچا' پھر سر ہلا دیا "بات تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے آواز دے کر اسلام الدین کو بھی بلا لیا "اسلام الدین' اختر اور اصغر بھاگ گئے ہیں۔ ان کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرانی ہے پولیس میں۔"

"ہائیں .... وہ بھاگ گئے۔ وہ تو کوٹھری میں تھا .... اختر۔"

"میں نے بتایا نا کہ وہ بھاگ گئے۔" شاہ جی نے اس پر آنکھیں نکالیں "تم میری بات سنو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

"رپورٹ درج ہو جائے گی شاہ جی!" اسلام الدین نے فیضو کو گھورتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے پھر کچھ غور و فکر کیا "اور وہ آفس سے ایک ہزار روپے لے کر بھاگے ہیں۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

"لیکن شاہ جی' یہ سچ نہیں ہے" فیضو نے احتجاج کیا۔

"تو چپ رہ۔" شاہ جی نے اسے ڈانٹا پھر کچھ سوچ کر نرم پڑ گئے۔

"یہ اس لیے ضروری ہے کہ پولیس جب انہیں پکڑے گی تو وہ ہمیں بدنام کرنے والی باتیں کریں گے۔ اس کا توڑ یہی ہے اور پولیس کیا کرے گی۔ وہ انہیں ہماری تحویل میں دے گی نا۔"

"میری مانیں تو شاہ جی' خاک ڈالیں اس معاملے پر۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔" نظام نے رائے دی۔

"تاکہ وہ ہمیں شہر بھر میں بدنام کرتے پھریں۔"

"ان کی کون سنے گا شاہ جی! آپ کی تو بڑی عزت ہے۔"

"بے اثر کوئی بات نہیں ہوتی اور عزت خراب ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ تم دونوں جاؤ اب۔" شاہ جی اسلام الدین کی طرف مڑے "تم سمجھ گئے ہو نا؟"

"جی شاہ جی! آپ بے فکر ہو جائیں۔" اسلام الدین نے کہا۔ نظام اور فیضو کمرے سے نکل آئے۔

فیضو اس رات ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ اسے احساس جرم ستا رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں بھلائی کی تھی لیکن وہ دونوں بچوں کے ساتھ زیادتی بن گئی۔ اگر وہ فرار نہ ہوئے ہوتے تو اب یتیم خانے میں زیادہ بہتر رہتے۔ شاہ جی نے اپنا رویہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر اب بچے دہری مصیبت میں تھے۔ ایک طرف تو ان کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا .... کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ جانے کہاں کہاں پھر رہے ہوں گے بے چارے ..... کھائیں گے کہاں سے .... سوئیں گے کہاں؟ اور اب پولیس کی مصیبت بھی گلے پڑ گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ اس نے انہیں بھاگنے کا موقع دیا تھا۔

بے چارے .... اس وقت نجانے کہاں سو رہے ہوں گے۔ اس نے سوچا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

○

نیند باجی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چندو کو خود سے لپٹائے ہوئے وہ

پندو ہی کے بارے میں سوچے جا رہی تھیں۔ ذہن کے پردے پر فلم سی چل رہی تھی۔

زکریا صاحب سے ان کی شادی کو چودہ برس ہو چکے تھے۔ وہ بہت اچھے انسان اور بہت اچھے شوہر تھے۔ چند مہینوں میں ہی باجی کو اندازہ ہوا کہ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔ لگتا تھا' اللہ نے انہیں بنایا ہی ایک دوسرے کے لئے ہے۔ ان کے درمیان کبھی تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے۔

باجی نے شادی سے پہلے کبھی بچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی.... بچوں سے پیار ہی نہیں کیا تھا مگر شادی کے بعد انہیں بچوں پر پیار آنے لگا۔ ماما کا خزانہ ان کے سینے میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ وہ بتدریج سامنے آتا گیا۔

شادی کو ایک سال ہوا پھر دو ...... اور پھر تین سال ہو گئے۔ ان کی گود ہری نہیں ہوئی۔ اب انہیں تشویش شروع ہوئی۔ پہلے علاج پر اور پھر فقیروں پر روپیہ خرچ ہونے لگا۔ باجی کو دو طرف کی فکر تھی۔ ایک تو یہ کہ خود انہیں اولاد کی آرزو تھی۔ دوسرے وہ عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو گئیں۔ مرد کی دوسری شادی کی تلواریوں تو اس معاشرے میں عورت کے سر پر لٹکی ہی رہتی ہے مگر اولاد نہ ہو تو اس تلوار کے سر پر گرنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے' ان کی مایوسی اور پریشانی بھی بڑھتی ہی گئی۔

زکریا صاحب سمجھ دار آدمی تھے۔ انہوں نے اس مسئلے کو سمجھ لیا۔ ایک دن وہ خود باجی کو سمجھانے بیٹھ گئے "دیکھو شمسہ' تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ میں یہ بات کہنے والا نہیں لیکن تمہیں یقین دلانے کے لئے کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔"

"میں یہ بات جانتی ہوں۔" باجی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اب یہ بھی سن لو کہ مجھے اولاد کی خواہش تو ہے مگر تم جانتی ہو' میں شاکر آدمی ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ اللہ کو منظور ہو گا تو ہماری خواہش پوری ہو گی' ورنہ نہیں ہو گی اور میں اس سلسلے میں نہ تمہیں قصور وار سمجھوں گا نہ خود کو۔ دیکھو نا' دنیا میں کسی کو بھی سب کچھ تو نہیں ملتا۔ ہر خواہش تو کسی کی بھی پوری

نہیں ہوتی۔ ہمیں تو اس پر خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔ میرے لیے تم بہت بڑی نعمت ہو .... اور میں کفران نعمت کرنے والا آدمی نہیں۔"

باجی انہیں حیرت سے دیکھتی رہیں "لیکن آرزو تو مجھے بھی ہے اور .... بہت زیادہ ...."

"اس میں کوئی حرج نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اسے مسئلہ نہ بناؤ۔ خوف زدہ نہ ہو۔"

یوں باجی قدرے مطمئن ہوگئیں۔ ان کا ایک مسئلہ حل ہوا .... عدم تحفظ کا ..... تو وہ دوسرے مسئلے میں الجھ گئیں۔ پیروں فقیروں کے' ڈاکٹروں اور حکیموں کے چکر لگتے رہے لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ شادی کو سات سال ہوگئے تو وہ مایوس ہوگئیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اب وہ دعا کے سوا کچھ نہیں کریں گی۔

باجی کے گھر کے سامنے ایک مکان چھوڑ کر اماں رہتی تھیں۔ وہ بہت نیک اور پابند شرع خاتون تھیں۔ نہ ان کی کبھی نماز قضا ہوئی تھی اور نہ ہی کبھی روزہ چھوٹا تھا۔ یہی نہیں' کسی حد تک وہ صاحب حال بھی تھیں۔ ان پر اکثر و بیشتر ایک ایسی بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اس کیفیت میں جو ان کے منہ سے نکل جاتا' اللہ کی مہربانی سے پورا جاتا۔

اماں ماشاء اللہ کنبے والی تھیں۔ بیٹا بیٹی' پوتا پوتی' نواسہ نواسی۔ اللہ نے انہیں ہر رشتہ عطا کیا تھا۔ بھرا ہوا گھر تھا۔ بس ایک کمی تھی' جس کی اللہ نے خوب اچھی طرح تلافی کی تھی۔ اماں جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں اور جب وہ بیوہ ہوئیں تو ان کے بچے بہت چھوٹے تھے۔ اماں خانہ دار خاتون تھیں۔ شوہر کی چھوڑی ہوئی زمین اور جائداد ان کے لئے مسئلہ بن گئی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہیں اور بچوں کو فاقے کرنے پڑے۔ جائداد کا تصفیہ کرانے والے انصاف نہ کرسکے۔ کمزور کے ساتھ انصاف کرنا ہوتا ہی مشکل ہے۔ بہرکیف جیسے تیسے گزارہ ہوتا رہا۔ اماں نے وہ کڑا وقت بڑی خود داری اور سربلندی سے گزارا۔ پھر انہیں ان کا حق تو نہیں' حق کا ایک معمولی سا حصہ ملا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ اسے بھی کسی کو سونپ کر اپنے بچوں کو سمیٹ پاکستان

آگئیں۔ یہاں ان کے بچوں نے بڑی محنت سے اپنا مقام بنایا۔ اللہ نے ہر اعتبار سے ان کے گھر کو برکت کا گہوارہ بنا دیا ..... روپے پیسے کے معاملے میں بھی اور اولاد کے معاملے میں بھی۔

پڑوس کا معاملہ تھا۔ ملنا جلنا ہوا تو باجی اماں کی گرویدہ ہو گئیں۔ پھر یہ گرویدگی ایسی بڑھی کہ اماں باجی کے لئے پیرانی کا روپ دھار گئیں۔ اماں کی کوئی بات باجی کبھی نہیں ٹالتی تھیں اور اپنا ہر دکھ' ہر پریشانی اماں ہی کو بتاتی تھیں۔

باجی کی شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے اور وہ اب بھی بے اولاد تھیں۔ ایسے میں ایک دن اماں نے اپنی مخصوص کیفیت میں انہیں مشورہ دیا "شمسہ' تم ایسا کرو کہ کوئی جانور پال لو۔ دکھ بٹ جائے گا۔ اولاد اللہ کی مرضی نہ سہی۔ اللہ کی کوئی مخلوق ہی اپنالو۔"

باجی نے سوال کیا بھی تو کیا ..... "اماں ..... کون سا جانور پالوں؟"

"جو تمہیں بھلا لگے۔ جس پر تم اپنی ممتا لٹا سکو۔"

"اچھا اماں۔"

"مگر یاد رکھنا۔ جانور پالنا بچے پالنے سے مشکل کام ہے۔ ماں بن کر ہی دکھانا ہوگا۔"

"بہت بہتر اماں۔"

باجی نے ایسے ہی کہہ دیا تھا ... ارادے کے بغیر۔ صرف اس لیے کہ اماں کی بات وہ ٹال نہیں سکتی تھیں مگر انہوں نے اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں۔ کچھ دیر غور ضرور کیا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا پالیں۔ کسی جانور پر دل ہی نہیں ٹھکتا تھا۔

شادی کے بعد باجی کے سینے میں ممتا کا جو چشمہ پھوٹا تھا' بارہ سال کے عرصے میں وہ بپھرا ہوا سمندر بن چکا تھا۔ اس کی وجہ سے ان پر کبھی کبھی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ دکھ کی' محرومی کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی خوشی کی وجہ سے۔ بس انہیں ایسا لگتا کہ ان کے سینے میں موجود دل پگھل رہا ہے۔ وہ دیر تک روتیں۔ ہچکیاں بندھ جاتیں۔ اس کے بعد وہ کئی

دن تک ہلکی پھلکی رہتیں۔

اس روز ان پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی لیکن وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھیں۔ وہ اماں کے گھر جانے کے ارادے سے چلیں مگر اپنے دروازے سے نکلتے ہی ٹھٹک گئیں۔ ایک بکریاں چرانے والا گزر رہا تھا۔ اس نے بھیڑ کے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں بھرا ہوا تھا۔ وہ میمنا باجی کو اتنا اچھا لگا کہ گویا آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا۔

"اے بھیا....؟" انہوں نے اسے پکارا۔

"جی باجی!"

"یہ میمنا کس کا ہے؟"

"میرا ہے باجی!"

"بیچو گے؟"

"جی باجی۔ مگر کچھ بڑا ہونے پر لے لیجئے گا۔"

"کیوں؟"

"ابھی یہ صرف تین دن کا ہے۔ ان کے بہت نخرے ہوتے ہیں باجی۔ ابھی یہ کچھ کھا بھی نہیں سکتا نا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ بیچنا ہو تو بتاؤ۔"

"یہ تو ہے ہی بیچنے کے لیے۔"

باجی نے میمنے کو گود میں لے کر دیکھا۔ وہ درحقیقت بہت حسین تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں مگر اس کا سب سے بڑا حسن اس کے ہاتھ پیروں پر کھروں سے ذرا اوپر سیاہ دائرے تھے۔ ایک سیاہ دائرہ پیشانی پر بھی تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

"کتنے کا دو گے؟" باجی نے پوچھا۔

"جو جی چاہے' دے دیں۔"

"نہیں بھیا۔ منہ مانگی قیمت دوں گی۔ یہ تو میرا بیٹا ہے نا۔"

"اچھا بیس روپے دے دیں۔"

باجی نے جیب میں روپے لا اسے دیے اور میمنے کو گھر میں لے گئیں۔ انہوں نے اسے سینے سے لپٹایا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا "میرا بیٹا بنے گا؟"

اب نجانے وہ ان کا خیال تھا یا سچ مچ ننھے سے میمنے کی آنکھوں کی چمک ان کے لئے جواب بن گئی۔ کیفیت تو ان پر پہلے ہی طاری تھی۔ ان کی آنکھیں برسیں اور ایسی برسیں کہ ان کے آنسوؤں نے چھوٹے سے میمنے کو سچ مچ نہلا دیا۔ اس دوران وہ اسے دیوانہ وار پیار کیے جا رہی تھیں .... چوم رہی تھیں۔

آنسو تھمے تو باجی کو احساس ہوا کہ ان کا وجود ایک ایسی خوشی سے سرشار ہو گیا ہے، جس سے وہ متعارف ہی نہیں تھیں۔ ان کا وجود بیٹے کی محبت اور اللہ کی شکر گزاری سے لبالب بھر گیا تھا۔ وہ تو اس وقت ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ بادلوں پر تیر رہی تھیں۔

محبت کی وہ بارش رکی تو وہ میمنے کو گود میں لیے اماں کے پاس چلی گئیں۔ اماں اس وقت عصر کی نماز پڑھنے کے بعد دعا کر رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں "کیسی ہو شمسہ؟ بہت خوش نظر آ رہی ہو۔"

باجی نے میمنے کو آنچل میں چھپایا ہوا تھا۔ انہوں نے آنچل ہٹا کر اماں کو دکھاتے ہوئے کہا "اماں .... یہ میرا بیٹا ہے۔"

اماں نے بہت غور سے میمنے کو دیکھا "ماشاء اللہ .... بہت پیارا ہے۔" انہوں نے کہا "نام کیا رکھا ہے اس کا؟"

"اماں .... یہ تو میری اندھیری رات کا چاند ہے۔" باجی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں نام سوجھ گیا "اس کا نام چندو ہے اماں۔"

"پیارا نام ہے۔ اللہ تمہیں ماں بننے کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔"

باجی چندو کے لیے فیڈر خرید کر لائیں اور دودھ کا بندوبست کیا۔ وہ بوتل سے اسے دودھ پلا رہی تھیں کہ بھائی جان دفتر سے آ گئے "یہ کیا ہے شمسہ؟"

"یہ میرا .... ہمارا بیٹا ہے چندو۔"

بھائی جان نے انہیں ایسی نظروں سے دیکھا' جیسے ان کے خیال میں باجی کا دماغ چل گیا ہو "یہ کیا حماقت ہے ...."

"آگے کچھ نہ کہئے گا۔" باجی نے تیز لہجے میں کہا "میں آپ کو بتا چکی ہوں' یہ میرا بیٹا چندو ہے۔"

معاملہ فہم بھائی جان سمجھ گئے کہ احتیاط سے کام نہ لیا تو تلخ کلامی اور لڑائی جھگڑے کا صاف ستھرا ریکارڈ خراب ہو سکتا ہے۔ "ٹھیک ہے بھئی۔ ویسے ہے بہت پیارا۔"

باجی یوں کھل اٹھیں جیسے کوئی ماں اپنے بیٹے کی تعریف پر کھلتی ہے "گود میں نہیں لیجئے گا؟"

"لوں گا مگر پہلے تو اسے نیچے چھوڑ کر دکھائیں۔ چلتا بھی ہے یا نہیں۔"

باجی نے چندو کو نیچے چھوڑا۔ چندو نے تو ایسی قلانچیں بھریں' ایسے کرتب دکھائے کہ باجی تو باجی' ان کے شوہر کا دل بھی لوٹ پوٹ ہو گیا۔

یوں چندو بیٹے کی حیثیت سے اس گھر میں پرورش پانے لگا۔ ابتدائی کچھ عرصہ تو بہت سخت تھا۔ باجی چندو کو ساتھ سلاتی تھیں .... اور یہ بھائی جان کو گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ الگ سونے لگے۔ باجی خود بھی بہت صفائی پسند تھیں لیکن ماں ان باتوں کو اہمیت دینے لگے تو بچے نہیں پال سکتی۔ وہ اس کا گوں موت بھی برداشت کرتی رہیں مگر جب چندو بڑا ہو گیا تو انہوں نے اس کی تربیت شروع کر دی۔ دیکھو چندو ..... ہر جگہ پیشاب پاخانہ نہیں کرتے۔ لیٹرین میں جاتے ہیں۔ چندو' ہر چیز میں منہ نہیں ڈالتے .... وغیرہ وغیرہ۔

جانور انسان کی گود میں آنکھیں کھولے اور اسے ایسی اور اتنی محبت ملے تو وہ جانور نہیں رہتا۔ وہ اپنے مالک کی فطرت اور عادات اپناتا ہے۔ اس کی ہر بات سمجھتا ہے۔ بس ایک مجبوری ہے۔ وہ انسان سے اس کی زبان میں بات نہیں کر سکتا اور چندو عام جانوروں سے بھی بڑھ کر تھا۔ وہ باجی کی ہر بات سمجھتا تھا۔

پھر بھی جانور تو جانور ہی ہے۔ تربیت کے دوران تو انسان کے بچے بھی پٹتے ہیں۔ باجی کا دل تو بہت دکھتا تھا مگر مارنا ضروری ہو جاتا تھا۔ پھر بھی اسے مار کر وہ

گھنٹوں اداس رہتیں۔ خود سے بھی منہ چھپائے پھرتیں۔ خود پر بھی غصہ آتا اور ہر بار وہ روتی بھی تھیں۔ ایسے میں چندو ہی انہیں مناتا۔ وہ آکر ان کی ٹانگوں سے سر رگڑتا اور باریک سی ..... میں کی آواز نکال کر ان کے چہرے کو تکتا جیسے پوچھ رہا ہو .... ناراض ہیں؟ اور باجی اٹھا کر اسے گود میں بھر لیتیں۔

ایک بار وہ چندو کی پٹائی کر رہی تھیں کہ ان کی پڑوسن صفیہ آگئیں "اے ہے شمسہ، پاگل ہوئی ہو۔ بے زبان جانور کو ایسے مار رہی ہو۔"

"جانور ہوں گے آپ کے بچے۔" باجی نے غضب ناک ہو کر کہا" یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کی بھلائی کے لئے اسے مار رہی ہوں۔ اچھے ماں باپ بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ محبت کو بھی آڑے نہیں آنے دیتے۔"

صفیہ کھسیا گئیں "سچ مچ سرک گئی ہو۔"

"تو آپ کو کیا۔"

چندو کی وجہ سے باجی کی سوشل لائف ختم ہو گئی۔ اسکول میں بھی وہ مشکل ہی سے وقت گزارتی تھیں۔ وہ اسکول میں ہوتیں تو چندو گھر میں کھلا پھرتا مگر مجال ہے جو اس نے کبھی لیٹرین کے سوا کہیں پیشاب اور مینگنیاں کی ہوں۔ بہرحال باجی نے اس کی خاطر ہر تعلق توڑ لیا اور ماں سے بڑھ کر ماں بن گئیں۔ کوئی خود ہی ملنے آجاتا تو مل لیتیں۔

یوں بڑا ہوتے ہوتے خوش اطوار چندو پورے محلے کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔

باجی نے گہری سانس لی اور بے حد خوشی سے چندو کو دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ ان کے گلے میں تھا۔ یہ کتنا پہلے کی بات ہے؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔ پھر مسکرائیں۔ اس بات کو دو سال کے لگ بھگ ہو گئے تھے۔

اچانک انہیں سردی کا احساس ہوا۔ صبح ہوتے ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے پیروں کے پاس پڑا ہوا لحاف کھولتے ہوئے سوچا۔ پھر انہوں نے سوتے ہوئے چندو پر لحاف ڈال دیا۔ نیند اب بھی ان کی آنکھوں سے خفا تھی۔

○

اختر جانے کتنی دیر سویا ہوگا پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ یتیم خانے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی آنکھ سردی کی وجہ سے کھلی ہے۔ اس نے غور کیا تو پتا چلا کہ اس کے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ سے جڑے ہیں' وہ سمٹا ہوا لیٹا ہے اور سردی اس کے وجود کے اندر تک تھرتھراہٹ پیدا کر رہی ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا لیے۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ ٹھنڈ تو اسے نیچے سے چڑھ رہی ہے۔ تفتیش پر پتا چلا کہ وہ گھاس پر سو رہا تھا۔ اس کے نیچے دری بھی نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اصغر کو سردی لگی ہوگی تو اس نے دری کھینچ کر اوڑھنے کی کوشش کی' جو کامیاب بھی رہی۔ اس کے نتیجے میں اصغر نے اس کے نیچے سے دری کھینچ لی۔ اب اصغر مزے سے آدھی دری بچھائے' آدھی اوڑھے سو رہا تھا۔

ایک لمحے کو اختر کے جی میں آئی کہ اصغر سے دری چھین کر خود کو اس میں لپیٹ لے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ اچانک ہی بھوک کا احساس ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی نیند غائب ہوگئی تھی۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دیے ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔

اس چہل قدمی کے نتیجے میں اس کے جسم میں گرمی آگئی۔ سردی کا احساس تو دور ہوگیا مگر معدے میں بھوک کے پنجوں کی چبھن اور بڑھ گئی۔ وہ بے چین ہونے لگا۔

تھوڑی دیر گزری تو روشنیاں خود بخود بجھ گئیں پھر پرندوں کے چہچہے شروع ہوگئے۔ پرندوں کے غول کے غول نکلے اور رزق کی جستجو میں ادھر ادھر پرواز کرنے لگے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اختر یتیم خانے کی چار دیواری سے باہر بیٹھ کر صبح کا مشاہدہ کر رہا تھا مگر اس مشاہدے میں ارتکاز نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھوک تھی۔ وہ رہ رہ کر ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ اگر وہ پرندہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ مزے سے اڑتا پھرتا اور جہاں کہیں دانہ دنکا نظر آتا' چگنے کے لئے اتر جاتا اور وہ گوشت کی ضد سے بھی محفوظ

رہتا۔

اور کچھ دیر گزری۔ سورج طلوع ہوگیا۔ سورج کی ننھی منی کرنوں نے جسم کو چھوا تو سردی کا احساس دور ہوگیا۔ اصغر بھی جاگ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی نگاہوں میں بھی حیرت جھلکی پھر اس نے کہا "صبح ہوگئی۔"

دونوں وہیں گھاس پر بیٹھے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ چڑیوں کے چہکنے اور ہوا کی سرگوشیاں بتا رہی تھیں کہ کائنات جاگ اٹھی ہے لیکن انسان نہیں جاگے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی .... سوائے پرندوں کی آوازوں کے۔ کبھی کوئی گاڑی گزرتی تو سناٹا ایک لمحے کو ٹوٹتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

یتیم خانے میں تمام بچوں کو صبح سویرے جگایا جاتا تھا۔ وہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر میں صبح اسی وقت ہوتی ہے' جب وہ جاگتے ہیں' اسی لیے انہیں حیرت ہو رہی تھی۔

"یار اختر.... سب لوگ ابھی تک سو رہے ہیں۔" اصغر نے کہا۔

"ہاں۔ لگتا تو یہی ہے۔"

دونوں نے فوارے کے پانی سے منہ دھویا پھر وہ بیٹھ گئے۔ سڑکوں پر اب بھی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ انہیں گھبراہٹ ہونے لگی "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔" اصغر نے اچانک کہا۔

اختر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنی بھوک کے متعلق اسے کیا بتاتا۔ گزشتہ روز دوپہر کے قریب جو اس نے چائے پاپے کا ناشتا کیا تھا' اس کے بعد سے اب تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس کی ضد اور پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ اب وہ بس گوشت ہی کھائے گا۔

"یہ مجھے بھوک اتنی کیوں لگتی ہے؟" اصغر نے سوال اٹھایا۔

"مجھے بھی لگتی ہے۔" اختر نے کہا پھر کچھ دیر سوچتا رہا "شاید ہمیں اس لیے زیادہ بھوک لگتی ہے کہ ہماری بھوک مٹ نہیں پاتی اور شاید اس لیے کہ ہم یتیم ہیں۔"

دونوں اداس ہو گئے۔ اصغر سوچ رہا تھا کہ یتیم خانے میں یہ فائدہ تو تھا کہ اس وقت چائے اور اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو رات کی بچی ہوئی روٹی ہی مل جاتی لیکن یہاں تو وہ بے یار و مددگار تھا۔

اس وقت انہیں سڑک پر ایک چائے والا جاتا نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑی سی کیتلی اور پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھینکا تھا' جس پر پیالیاں لٹک رہی تھیں۔

دونوں تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے سڑک پار کرتے کرتے اسے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ اس نے دیوار کے قریب اپنی کیتلی اور دوسری چیزیں رکھیں اور ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں پہنچے تو چائے والے نے دو پیالیوں میں گرما گرم بھاپ اڑاتی ہوئی چائے انڈیلی اور پیالیاں ان کی طرف بڑھائیں۔ دونوں نے پیالیاں لے لیں۔

"کچھ کھاؤ گے؟" چائے والے نے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"باقر خانی ہے' بسکٹ ہیں' پاپڑی ہے۔" چائے والے نے پلاسٹک کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"چائے کتنے کی ہے؟" اصغر نے تفتیش شروع کی۔ اسے یاد آیا کہ رات پولیس والے نے اسے دس روپے دیے تھے۔

"دو روپے کی ہے۔"

اصغر حساب لگانے لگا۔ چائے کے بعد چھ روپے بچتے تھے "چھ روپے میں جو آئے' دے دو۔" اس نے دس کا نوٹ نکال کر چائے والے کی طرف بڑھا دیا۔

چائے والے نے آٹھ باقر خانیاں اور بسکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔

"کھاؤ یار۔" اصغر نے اختر سے کہا۔

"تو کھا۔ میں صرف چائے پیوں گا۔"

"ناشتے میں تو ضد نہ کر' ناشتے میں کوئی گوشت نہیں کھاتا۔"

اصغر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تو کھاؤں گا۔ گوشت ہی کھاؤں گا۔"

"تو چائے کیوں پی رہا ہے۔" اصغر نے جل کر کہا۔

"پینے کی بات اور ہے۔ گوشت پینے کی چیز تو نہیں ہے۔"

"میری مان تو بسکٹ اور باقر خانی کھالے۔ ضد کھانے کے وقت کرلینا۔"

"مجھے نہیں کھانا۔"

"تیری مرضی!"

چائے والا ان کی گفتگو دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اسے یہ بات عجیب لگی "تم لوگ کرتے کیا ہو؟" اس نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ ہم یتیم ہیں۔" اصغر نے جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"کل تک یتیم خانے میں رہتے تھے۔ رات ہم وہاں سوئے تھے۔" اصغر نے چورنگی کی طرف اشارہ کیا۔

چائے والے کو اپنے بچوں کا خیال آگیا۔ وہ بھی ایسے ہی گوشت کی ضد کرتے تھے۔ ابھی صبح بھی کررہے تھے۔ اس نے جیسے اپنے بچوں کو سمجھایا تھا' ویسے ہی اختر کو بھی سمجھانے لگا "آج تو جو مل جائے' کھالو۔" اس نے کہا "کل بقر عید ہے۔ پھر تین دن تک گوشت ہی گوشت ملے گا۔"

"میں تو اب بس گوشت ہی کھاؤں گا۔ بقر عید پر تو مل ہی جائے گا۔ مجھے تو آج چاہیے۔"

چائے والا کہنا چاہتا تھا کہ بہت سے لوگوں کو بقر عید کے دن بھی گوشت نصیب نہیں ہوتا لیکن اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے خالی پیالیاں اس کی طرف بڑھائیں تو اس نے ان میں مزید چائے انڈیل دی "میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں۔" اصغر نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" چائے والا بولا "یہ میری طرف سے ہے۔"

○

باجی کو صبح ہوتے نیند آئی تھی مگر چندو تو اپنے معمول کے مطابق اٹھنے کا عادی

تھا۔ کچھ دیر تو وہ یوں ہی پڑا رہا۔ باجی اور بھائی جان دونوں سو رہے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا لیکن اس پر وہ وقت بہت سخت ہوتا تھا اور وہ اسے بھی زیادہ دیر نہیں رہنے دیتا تھا۔ بھائی جان کو تو وہ نہیں جگاتا تھا۔ البتہ باجی کو جگا دیتا تھا۔

وہ اٹھا اور باجی کو پیار کرنے لگا۔ باجی کسمسائیں اور اٹھ بیٹھیں۔ کبھی ان کی نیند گہری ہوتی تو چندو پیار کرتے کرتے زبان سے انہیں چاٹنے لگتا تھا۔

باجی نے اٹھ کر چندو کو دیکھا "تو اٹھ گیا رے چندو۔"

چندو نے مخصوص انداز میں دھیمی سی آواز نکالی۔ باجی سمجھ گئیں۔ وہ ناشتا مانگ رہا تھا۔ باجی نے اٹھ کر سب سے پہلے اسے نہار منہ بادام پستے اور اخروٹ کھلائے پھر خود باتھ روم میں گئیں اور ناشتے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

دن کے معمولات کا آغاز ہو گیا تھا لیکن باجی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی عام دن نہیں ہے۔

انہوں نے چندو کو نہلایا' ناشتا کرایا۔ خود ناشتا کرنے کے بعد وہ شوہر کے جاگنے کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ اٹھے تو انہوں نے انہیں ناشتا دیا پھر وہ چائے پی ہی رہی تھیں کہ پڑوس کی ایک بچی آگئی۔ "باجی ..... آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔"

"آتی ہوں۔" باجی نے کہا۔ چائے کی پیالی دھو کر انہوں نے شوہر کو پکارا "سنتے ہیں۔ اماں نے بلایا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ آپ چندو کا خیال رکھیے گا۔"

اس روز اماں پر کیفیت طاری تھی!

جب بھی ایسا ہوتا' پاس پڑوس کی عورتیں ان کے گھر آجاتیں اور اپنے اپنے مسائل لے کر بیٹھ جاتیں۔ اماں سے مشورے لیے جاتے۔ سوال کیے جاتے۔ ایسے میں اماں کی ہر بات درست ثابت ہوتی تھی۔

اس روز اماں نے کیفیت طاری ہوتے ہی سب سے پہلے حکم دیا "شمسہ کو بلا کر لاؤ۔"

باجی آئیں۔ انہوں نے بڑے ادب سے اماں کو سلام کیا۔ اماں نے جواب دینے کے بعد کہا "شمسہ کے سوا سب لوگ چلے جائیں۔"

اس پر وہاں موجود عورتوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ گھر کے تمام لوگ تو کمرے سے چلے گئے۔ پڑوس کی عورتوں میں سے کوئی نہیں اٹھی۔

"میں نے کہا ہے کہ شمسہ کے سوا سب لوگ چلے جائیں۔" اماں نے اپنی بات دہرائی۔

اس کے بعد کسی کی رکنے کی مجال نہیں تھی۔ اس کیفیت میں اماں کی آواز اور ان کا لہجہ ایسا بارعب ہو جاتا تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی تھی کہ نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ خود بھی نظر نہیں اٹھاتی تھیں۔

"یہاں .... میرے پاس بیٹھ جاؤ شمسہ۔" اماں نے تخت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

باجی اماں کے پاس .... بہت قریب بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ گھبرا رہی تھیں۔ ایسا تخلیہ اماں نے پہلے کبھی طلب نہیں کیا تھا "جی اماں؟"

"شمسہ..... میں جو کہوں گی' مانو گی؟"

"آپ کی کوئی بات کبھی ٹالی ہے اماں؟"

"لیکن جو میں آج کہنے والی ہوں' پہلے کبھی کہا بھی نہیں۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھیں اماں۔"

"دیکھیں گے۔" اماں نے کہا پھر جیسے موضوع بدل دیا "شمسہ' تم قربانی کیوں نہیں کرتیں؟"

"ہم صاحب نصاب نہیں ہیں اماں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانور تمہارے پاس موجود ہے۔ پھر قربانی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔"

ایک لمحے کو باجی کی رنگت متغیر ہوئی مگر انہوں نے فوراً" ہی خود پر قابو پالیا۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ اماں' آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے پاس جانور کہاں ہے۔ جو اماں کہہ رہی تھیں' وہ اسے سمجھ رہی تھیں۔ وہ بولیں "اماں' میں چندو کو جانور کب سمجھتی ہوں۔ وہ تو میرا بیٹا ہے۔"

"میں جانتی ہوں مگر وہ ہے تو جانور ہی نا۔"

باجی خاموش رہیں۔ کوئی اور یہ بات کہتا تو وہ لڑپڑتیں۔

"یہ اور اچھی بات ہے کہ تم نے اسے بیٹے کی طرح پالا ہے' بیٹے کی طرح چاہتی ہو اور بیٹا ہی سمجھتی ہو مگر ہے تو وہ جانور ہی۔"

"جی اماں۔" باجی نے بمشکل کہا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائیں لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔

"تم میری بات سمجھ رہی ہو نا شمسہ؟"

"جی اماں۔"

"تو کیا خیال ہے؟" اماں نے کہا "چندو کی قربانی کرو گی؟"

باجی نے چند لمحے سوچا پھر اچانک ہی رونے لگیں "اماں ..... مشکل .... بہت مشکل بات ہے۔"

اماں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں کہا "قربانی آسان کب ہوتی

ہے۔ وہ تو مشکل ہی ہوتی ہے۔ آسان ہو تو قربانی تو نہ ہوئی۔"

باجی بدستور رو رہی تھیں۔ ان کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ "اماں .... چندو میرے جگر کا ٹکڑا ہے .... میری جان ہے۔"

"تو اللہ کے حضور کوئی گری پڑی چیز پیش کی جاتی ہے۔" اماں کا لہجہ سخت ہوگیا "جس چیز سے محبت نہ ہو' جسے قربان کرکے دل دکھ سے بوجھل نہ ہو' آنکھیں آنسو ضبط کرنے سے نہ جلیں' جسے کھونے کا آپ کو ملال نہ ہو' وہ چیز تو قربانی کے لائق ہی نہیں ہوتی۔ اللہ کو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ یہ تو بندے ہی کی بہتری کے لئے ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں لیکن میرا گھر' میرا دل اجڑ جائے گا۔"

"جنت میں گھر انہی کے آباد ہوتے ہیں جو یہاں اللہ کی راہ میں گھر اجاڑ دیں اور دل وہی آباد ہوتے ہیں شمہ' جن میں اللہ کی محبت ہو اور جس دل میں ماسوا کی محبت ہو' وہ تو ہوتا ہی اجڑنے کے لئے ہے۔"

باجی پر لرزہ چڑھ گیا۔ اماں نے وہ حقیقت بیان کر دی تھی۔ جو ہر ایک کو یاد ہونی چاہیے لیکن جو یاد کسی کو نہیں رہتی۔

"قربانی کیا ہے شمہ۔ یہ تو بندگی کا عہد ہے۔ قربانی کریں تو یہ یاد رہے کہ ہمارا سب کچھ اللہ کا دیا ہوا اور اللہ ہی کے لئے ہے۔ ہمارا اپنا کچھ بھی نہیں۔ اپنے اعمال اور آخرت کے سوا۔ نعوذ باللہ' اللہ کو ہماری کسی چیز کی ضرورت نہیں مگر وہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہماری بہتری چاہتا ہے۔ جانتا ہے کہ ہم عہد بندگی بھول جاتے ہیں' بھولتے رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں سال میں ایک بار یہ یاد دلانے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر ہم ایک بار ایسی سچی قربانی کر دیں تو شاید عہد بندگی کبھی نہ بھولیں۔"

باجی روئے جا رہی تھیں "وہ میری جان ہے اماں۔"

"جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی۔" اماں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"

ایک پل میں جیسے باجی کی کایا پلٹ ہوگئی۔ ان کے اندر ایک لہر سی اٹھی اور سب کچھ بہا کر لے گئی۔ انہوں نے ایک عزم سے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے

اور بے حد مضبوط لہجے میں کہا۔ "اماں .... ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کی خاطر چندو بھی قربان اور میں بھی۔ اس لیے کہ سب اسی کا دیا ہوا ہے۔"

"شاباش شمسہ' اللہ تمہارا گھر آباد رکھے گا۔" اماں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کل چندو کو قربان کر دوں گی اماں۔"

"قربانی کے آداب بھی معلوم ہیں شمسہ؟"

"آپ بتایئے اماں۔"

"کلیجی گھر والوں کے لیے ہوتی ہے۔ گوشت کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک اپنے .... گھر کے لیے۔ دوسرا رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لیے اور ایک غریبوں اور مسکینوں کے لئے۔ یہ آپ کا حق ہے کہ اپنا حصہ بھی دوسروں کو دے دیں۔"

"اماں ..... ہم چندو کا گوشت کیسے کھاسکتے ہیں۔" باجی پر پھر رقت طاری ہونے لگی۔ یہ خیال ہی ان کے لئے سوہان روح تھا کہ ان کا چہیتا چندو ذبح کیا جائے گا اور اس کے حصے بخرے ہوں گے۔ کجا یہ کہ وہ اسے کھائیں بھی ....

"دیکھو شمسہ' دکھ تو فطری ہے۔" اماں نے انہیں سمجھایا۔ "اس کے بدلے اللہ سکون قلب عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ دکھ کے ساتھ کم ظرفی ہو تو بات گستاخی تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمیں تو یہ تسلیم کرنا ہے کہ اللہ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے۔ زیادہ نہ سہی' تھوڑا بہت گوشت تو تمہیں کھانا ہوگا۔"

"اتنا حوصلہ کہاں سے لاؤں گی اماں؟"

"شمسہ' اگر تم کبھی میرے ہاں مٹھائی لے کر آؤ تو میں تواضع کرتے ہوئے مٹھائی تمہارے سامنے رکھوں گی نا۔ تمہیں وہ کھانی ہوگی۔ اگر اکراہ کرو گی تو میں یہی سوچوں گی ناکہ یا تو شمسہ شرما حضوری میں یہ مٹھائی لائی ہیں یا پھر وہ مٹھائی لائی ہیں' جو خود انہیں پسند نہیں اور دونوں باتیں اچھی نہیں۔ جب کہ قربانی تو ہم اللہ کے حضور پیش کر رہے ہیں۔ اب وہ حکم دے کہ تم بھی کھاؤ تو انکار کا .... اکراہ کا مطلب سمجھتی ہو؟"

باجی پر لرزہ چڑھ گیا "اماں ..... میرے لیے حوصلے کی دعا بھی تو کریں۔"

"جاؤ شمسہ 'اللہ بڑا کارساز ہے۔"

باجی اماں کے کمرے سے نکلیں تو بید مجنوں کی طرح لرز رہی تھیں۔

○

اس صبح ریاض صاحب بہت دیر سے سو کر اٹھے۔ بہت دنوں کے بعد ایسی پرسکون نیند آئی تھی۔ اٹھ کر انہوں نے ناشتا کیا اور کمال یہ ہوا کہ انہیں پھر سے نیند آنے لگی۔ وہ نہ سوتے لیکن سلمی بیگم نے اصرار کرکے انہیں مزید سونے پر مجبور کر دیا۔

دوسری بار سلمی بیگم نے ہی انہیں جگایا "اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔"

ایک عرصے کے بعد وہ دوپہر کے وقت بچوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تھے۔

چھوٹا فیاض اترا گیا اور دوبارہ سے گوشت کی ضد کرنے لگا۔

"دیکھو' میں نے کتنے مزے کا لوبیا پکایا ہے۔" سلمی بیگم نے اسے سمجھایا "یہ گوشت سے زیادہ مزے دار ہے۔"

"لیکن گوشت تو نہیں ہے۔" فیاض نے دلیل دی۔

"ابو اتنے دن ہوگئے' ہم نے گوشت نہیں کھایا۔" اشعر نے شکایت کی۔

"بیٹے' کل جی بھر کے کھا لینا۔"

"ابو ..... آج بہت جی چاہ رہا ہے گوشت کو۔" اس بار میمونہ بولی۔

سلمی بیگم تڑپ گئیں۔ بیٹی نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی "ایک دن صبر کرلو مونا۔" انہوں نے محبت سے کہا۔

"ٹھیک ہے امی۔"

بیٹی کی یہ تسلیم کی ادا سلمی بیگم کو اور زخمی کر گئی۔ ان سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ حالاں کہ لوبیا بہت اچھا پکا تھا۔ بچوں نے گوشت کی ضد کے باوجود ڈٹ کر کھانا کھایا۔ ریاض احمد نے بھی طبیعت سے کھانا کھایا۔ پچھلے عرصے میں

انہوں نے دوپہر کا کھانا ایک دن بھی نہیں کھایا تھا۔

کھانے کے بعد بچے ریاض احمد کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ اس روز ریاض احمد بھی مطمئن اور خوش تھے۔ میمونہ اور اشعر کے اسکول کی کاپیاں دیکھتے رہے۔ انہیں خوشی ہوئی کہ بچوں کی پڑھائی بالکل متاثر نہیں ہوئی ہے ورنہ وہ تو سمجھے تھے کہ اس عرصہ بحران میں سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔

"ابو' میں اسکول کب جاؤں گا؟" فیاض نے پوچھا۔

"انشاء اللہ اس بار تمہیں بھی اسکول میں داخل کرا دیں گے۔"

فیاض خوش ہوگیا "ابو' اس بار آپ بکرا نہیں لائے۔" اس نے کہا۔

"عید کے تیسرے دن لائیں گے بیٹے اور قربانی کریں گے۔"

یہ سن کر تو تینوں بچے خوش ہوگئے "سچ ابو' پھر ہم خوب گوشت کھائیں گے۔" اشعر بولا۔

"گوشت تو تم انشاء اللہ کل بھی خوب کھاؤ گے۔" ریاض احمد نے کہا۔

اس دوران ریاض احمد کو ہر پل یہ احساس رہا تھا کہ سلمی بیگم کھانے کے وقت سے اداس اور چپ چپ ہوگئی ہیں۔ بچے ان کے پاس گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا بیٹھے۔ پھر اشعر اور فیاض آنگن میں کھیلنے چلے گئے اور میمونہ کمرے میں جاکر سوگئی۔

ریاض احمد سلمی بیگم کے پاس جا بیٹھے "کیا بات ہے؟ آپ کو کیا ہوا؟" انہوں نے بیوی سے پوچھا۔

"ہماری بیٹی بہت صابر ہے۔" سلمی بیگم نے آہ بھر کر کہا "لیکن آج اس کا صبر جواب دے گیا ہے۔"

"ہاں' اس بات سے مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی۔"

"ایک بات کہوں۔ میرے پاس پچاس روپے ہیں۔ آپ جاکر گوشت لے آئیں تو ہم رات کے کھانے پر بچوں کو سرپرائز دیں گے۔"

ریاض احمد نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ "اب اس وقت گوشت ملنا مشکل ہے۔ خیر' آپ پیسے دیں' میں دیکھتا ہوں۔"

سلمی بیگم نے پیسے لاکر انہیں دیے۔ وہ گھر سے نکل آئے۔

○

دونوں لڑکوں کو پھرتے پھرتے دوپہر ہوگئی۔ اصغر ایک بار پھر بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ اختر کا تو حال ہی ابتر تھا لیکن اب وہ بھوک کے متعلق بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلتے چلتے دوبارہ لالو کھیت پہنچ گئے تھے۔

"دیکھو اختر بھائی، اب جو بھی ملے، کھا لینا۔ گوشت کل مل جائے گا۔" اصغر نے اختر کو سمجھایا۔

"تو میری فکر نہ کر، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔" اختر نے بھنا کر کہا۔

بازاروں میں اس روز بھی بہت رش تھا۔ ظاہر ہے۔ اگلے روز عید جو تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے رہے۔ سامنے انہیں ایک ہوٹل نظر آیا۔ انہوں نے سڑک پار کی اور ہوٹل کی طرف چل دیے۔

ہوٹل میں بھی رش تھا۔ وقت بھی کھانے کا تھا۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ دونوں للچائی ہوئی نظروں سے کھانے والوں کو دیکھتے رہے۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دونوں کا بھوک سے برا حال تھا لیکن انہیں کسی سے سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ دیر تک کھڑے رہے۔ ہوٹل سے دو جوان آدمی کھانا کھا کر نکلے۔ ان میں سے ایک کی نظر ان پر پڑ گئی۔ بھوکے کے سامنے کھانا ہو، مگر پہنچ سے دور تو اس کا حال کسی سے چھپا نہیں رہتا۔ اس جوان آدمی نے بھی سمجھ لیا کہ وہ بھوکے ہیں "کھانا کھاؤ گے؟" اس نے ان سے پوچھا۔

اصغر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اختر کو یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔

"ٹھہرو، میں ابھی باہر والے سے بات کرتا ہوں۔ وہ تمہیں کھانا لا دے گا۔ پیسے میں دے دوں گا۔"

جوان آدمی ہوٹل کی طرف جانے کے لئے پلٹ ہی رہا تھا کہ اختر نے کہا "میں تو گوشت کھاؤں گا۔"

جوان آدمی بے حد غصہ ور تھا۔ اس نے کہا "کیا کہا بھئی تو نے؟"

اختر نے اپنی بات دہرا دی۔

"اے میں تجھے کھانا کھلا رہا ہوں۔ جو میں کھلاؤں گا' کھانا پڑے گا۔"

"میں تو گوشت ہی کھاؤں گا۔"

"بھکاری ہو کر اتنے نخرے....."

"ہم بھکاری نہیں ہیں....." اختر کو لفظ بھکاری گالی کی طرح لگا۔

"بھکاری نہیں تو اور کیا ہے بے۔" جوان آدمی کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہم نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں۔ آپ نے خود ہی پوچھا تھا کھانا کھاؤ گے۔"

"غلطی ہوئی مجھ سے۔ اب ہٹ جا سامنے سے۔ نہیں تو ایک دوں گا....."

"یہ زمین تو اللہ کی ہے....."

جوان آدمی نے پوری قوت سے اختر کے رخسار پر تھپڑ رسید کیا۔ اس کا ساتھی اسے کھینچتا ہوا لے گیا ورنہ شاید وہ اختر کو اور مارتا۔

"تکلیف سے زیادہ ذلت کا احساس تھا کہ اختر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "ہم نے کسی سے کچھ مانگا تو نہیں تھا۔" وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا "ہم بھیک مانگنے والے تو نہیں ہیں۔"

"تو اور تیری ضد مجھے بھی بھوکا مار دے گی۔" اصغر نے غصے سے کہا۔ وہ بھوک سے پاگل ہو رہا تھا۔

شاہ جی کے ہاتھوں بری طرح پٹ کر اف نہ کرنے والا باہر ایک اجنبی کے تھپڑ پر بلک کر رو رہا تھا۔ ایسے میں اپنے ساتھی اور دوست کا یہ جملہ اسے ہنٹر کی طرح لگا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اصغر کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شکایت' ملامت اور جانے کیا کیا تھا۔ دکھ اس بات کا بھی تھا کہ اصغر نے پہلے کبھی اس کی زیادتی پر چوں بھی نہیں کی تھی۔ اس نے اصغر کو دیکھا ضرور لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔

اصغر کو فوراً" ہی اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا۔ کچھ تو اسے اختر کی نگاہوں نے... اور اس کی خاموشی نے مارا۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے رات پیٹ بھر کر کھانا بھی کھایا تھا اور صبح کو ناشتا بھی کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے ایسی پاگل کر دینے والی

بھوک لگ رہی ہے تو اختر کا کیا حال ہوگا' جس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور صبح ناشتا بھی نہیں کیا۔ کوٹھری میں چائے اور پاپے کھائے ہوئے ایک دن اور ایک رات ہو چکی تھی۔

وہ اختر سے محبت کرتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا۔

دونوں وہیں ہوٹل کے سامنے بیٹھے تھے۔ تھپڑ والے واقعے کے بعد وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا۔ ایک تماشائی ان سب کو تفصیل بتا رہا تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ان میں سے کسی کے پاس ہمدردی کے دو بول نہیں تھے۔ کوئی طنز کر رہا تھا۔ کوئی ملامت ' ہاں میاں' یہ آج کل کے بھکاری ہیں۔ بھیک دینے والے کو بھی ذلیل کردیں۔ پیٹ بھرے ہیں میاں۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ بھلائی کرو تو برائی ملتی ہے۔ اچھا کیا جو مارا بھائی۔

یہ تبصرے روح کو اور تڑپا رہے تھے۔ اختر کو لگ رہا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی ٹھوس چیز ہے جو نرم ہوتے ہوئے پگھلنے کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کا سینہ آنسوؤں سے بھر گیا ہے اور آنسوؤں کو روکنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر اور گھٹ گھٹ کر' سر جھکائے روتا رہا۔

تبصرے جاری رہے۔ پھر ایک خوف ناک جملہ سامنے آیا "یہ چھوٹا اچھا ہے لیکن اس کے ساتھ رہنے کی سزا بھگت رہا ہے۔ سچ تو کہا ہے۔ اس کے ساتھ رہے گا تو بھوکا ہی مرے گا۔"

اصغر نے سر اٹھا کر کہنے والے کو دیکھنا چاہا مگر وہاں اتنے لوگ تھے۔ کون جانے' کس نے یہ بات کہی تھی۔ اصغر ڈرپوک اور صلح جو تھا مگر اس وقت اس کے اندر وحشت امنڈنے لگی۔ کاش وہ ان سب کا کچھ بگاڑ سکتا۔ اس ایک جملے نے اسے اس کی نظروں میں گرا دیا تھا۔ اختر کی نظروں میں تو وہ پہلے ہی گر چکا تھا اور اختر وہ تھا' جو یتیم خانے میں اسے ہر مصیبت سے بچاتا تھا۔ کوئی شریر لڑکا اس کے درپے ہوتا تو ہمیشہ اختر ہی بیچ میں آتا اور آج اس کی وجہ سے اختر کے ساتھ یہ ہو رہا تھا۔

اصغر کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اس نے اختر کا ہاتھ تھاما اور بولا "چل یہاں سے۔"

اختر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اختر کمزور تھا اور اصغر طاقت ور

"اب ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے، کچھ نہیں مانگیں گے۔ بس اللہ سے مانگیں گے۔ وہ سب کچھ دے سکتا ہے۔ مولوی صاحب یہی بتاتے تھے نا۔" اصغر نے کہا۔

اختر خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"تیری بھوک تو مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ تو صبر کر سکتا ہے۔ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" اصغر بولے جا رہا تھا۔

آگے بھیڑ بہت تھی۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے رہے مگر ایک جگہ خریداروں کے ریلے میں ان کے ہاتھ چھوٹ گئے۔ قدم روکنا اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ اتنے ہجوم میں آدمی خود کہاں چلتا ہے۔ دوسرے اسے چلاتے ہیں۔ پھر دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ریت تھی۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں تھا کہ وہ مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں۔ ہر بڑھتا ہوا قدم انہیں ایک دوسرے سے دور کر رہا ہے۔

اختر کو سنبھلنے کا موقع ملا تو وہ لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ کے سامنے تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اصغر کہیں نہیں تھا۔ وہ تڑپ کر اسے پکارتا رہا۔ بھوک اور پھر ذہنی اذیت اور رونے کے نتیجے میں وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ جاکر مارکیٹ کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھ گیا۔

اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ دو تھے تو طاقت تھے۔ ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ اب وہ اکیلا کیا کرے گا۔ پھر اسے اصغر کی بات یاد آئی۔ ٹھیک تو کہہ رہا تھا۔ وہ اور اس کی ضد اصغر کو بھی بھوکا مروا دیتی۔ اچھا ہی ہوا، وہ الگ ہوگئے۔ اب اصغر بھوکا تو نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی جارحیت ختم ہوگئی۔ اس پر سپردگی طاری ہونے لگی۔ اچھا ہے، میں مر ہی جاؤں۔

دوسری طرف اصغر اس سے زیادہ پریشان تھا۔ وہ دس نمبر پہنچ گیا تھا اور بے تابانہ اختر کو تلاش کرتا پھرا تھا لیکن اختر ہوتا تو ملتا۔ کوئی مشکل آپڑے تو آدمی بے حد خود غرض ہو جاتا ہے۔ وہ اختر کی فکر کر رہا تھا تو وہ بھی اپنے حوالے سے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کا کیا بنے گا۔ اختر سب کچھ سوچ سکتا تھا، سب کچھ کر سکتا تھا۔ اب وہ کہاں سوئے گا.... کیا کرے گا؟ وہ روتا اور اختر کو پکارتا رہا....

○

Rehan
http://www.rehanahmeds.com

باجی پریشان تھیں کہ شوہر سے کس طرح بات کریں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ بہت سخت مرحلہ ہے۔ وہ اس کے لئے خود کو تیار کر رہی تھیں۔ اس مرحلے کے لئے ان کا مضبوط ہونا ضروری تھا۔ لیکن وہ اس معاملے میں الٹی کمزور تھیں۔ انہوں نے اماں کی بات مان لی تھی۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ چندو دنبہ ہے' جسے قربان کیا جاسکتا ہے مگر اندر کی آواز کہتی تھی کہ چندو دنبہ ہے لیکن ان کا بیٹا ہے اور اسے قربان نہیں کیا جاسکتا۔

وہ بیٹھی یہی کچھ سوچے جا رہی تھیں کہ چندو آگیا اور ان کی ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں لیکن وہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں "چندو..... تو میرا بیٹا ہے نا؟"

چندو اور شدت سے ان کی ٹانگوں سے سر رگڑنے لگا "دیکھو بیٹا' اللہ کی خوشی کے لئے تو سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ ہے نا؟"

چندو نے سر اٹھایا اور انہیں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معصومیت تھی۔

"اس پر تو میں خود کو بھی قربان کرسکتی ہوں۔" باجی نے.... خود کلامی کے انداز میں کہا "اور چندو' میں نے تجھ سے بہت محبت کی ہے نا..... ماں جیسی؟"

چندو نے اپنی مخصوص اور مختصر سی آواز نکالی' جیسے کہہ رہا ہو..... ہاں ماں....

"تو بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟"

چندو نے پھر وہی آواز نکالی۔

"بس تو بیٹا' ہنسی خوشی قربان ہو جانا۔" باجی کی آواز رندھنے لگی۔

چندو ان کے پیروں میں یوں لیٹ گیا' جیسے قربان ہو رہا ہو۔ اس انداز میں بس گلے پر چھری پھیرنے کی کسر تھی۔

باجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تو مجھے برا اور ظالم تو نہیں سمجھے گا؟"

چندو نے اور باریک اور مختصر آواز نکالی۔

"بس اب جا۔ کھیل جاکر۔"

چندو چلا گیا۔ باجی روتی رہیں مگر یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان کے اندر مضبوطی آگئی ہے۔ چندو انہیں حوصلہ دے کر گیا تھا لیکن سخت مرحلہ ابھی باقی تھا۔ اپنے شوہر کو وہ کیسے قائل کریں؟ ان سے کیسے بات کریں؟

یہ مشکل بھائی جان نے آسان کر دی۔ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئے "کیا بات ہے شمسہ؟ کچھ پریشان ہیں آپ؟"

"نہیں تو۔" باجی نے کہا "میں نے ایک مشکل فیصلہ کیا ہے۔ کل ہم چندو کی قربانی کریں گے۔"

پہلے تو بھائی جان کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا پھر ان کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا "کس خبیث نے کہا ہے۔ مجھے نام بتاؤ۔ میں خون پی جاؤں گا اس کا۔"

"میں حاضر ہوں۔ پی جایئے خون۔"

بھائی جان سناٹے میں آگئے "یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے شمسہ بیگم؟" انہوں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔"

"مگر کیوں۔ بیٹا تو وہ ہم دونوں کا ہے۔ میرا بھی اور آپ کا بھی۔"

باجی نے اس لمحے ایک اور فیصلہ کیا۔ انہیں جارحانہ طرز عمل اختیار کرنا تھا ورنہ معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ بے شک' شوہر کا دل دکھتا لیکن بعد میں وہ تلافی کر سکتی تھیں..... انہیں سمجھا سکتی تھیں۔ "بہت بڑا دعوی کر رہے ہیں آپ۔" انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور آپ کی یادداشت بھی شاید کمزوری ہوگئی ہے۔ اس کے گو موت سے ایسا گھبراتے تھے آپ کہ ساتھ سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب کچھ میں کرتی رہی۔ اسے لپٹا کر سلاتی رہی۔ صبح اٹھتی تھی تو اس کے پیشاب میں نہائی ہوئی ہوتی

بو میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ میرے سوا کون یہ فیصلہ کرسکتا ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے زیادہ دکھ ہوگا اس قربانی کا۔"

بھائی جان کا چہرہ فق ہوگیا "باپ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔" انہوں نے مدافعانہ لہجے میں کہا "اسی لیے ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔"

"تو پھر ماں سے بڑھ کر بات بھی نہ کریں۔"

"باپ تو کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ نہیں مانتے تو کل میں چندو کی جگہ خود کو قربان کر دوں گی۔"

بھائی جان تھرا کر رہ گئے۔ سب کچھ اتنا اچانک سامنے آیا تھا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا "ٹھیک ہے شمسہ بیگم! آپ جیت گئیں۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

باجی کھل اٹھیں "بس تو جاکر چندو کے لئے بادام، پستے اور اخروٹ لے آئیں۔ آج اسے جی بھر کے کھلائیں گے۔"

بھائی جان میں دم مارنے کا یارا بھی نہیں تھا!

○

اختر کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیا بنے گا۔ وہ مایوس تھا۔ مایوس اور امید سے محروم۔ اصغر اس سے بچھڑ گیا تھا۔ بھوک اس کے لئے ایک بپھری ہوئی موج بن گئی تھی، جو کسی بھی لمحے اسے نگل سکتی تھی۔ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔

اچانک اس کے وجود میں جیسے روشنی سی ہوگئی۔ کرامت بابا کی آواز اس کی سماعت میں گونجنے لگی "صرف اللہ ہی ضرورت مندوں کے کام آتا ہے۔ جس کی کوئی مدد نہیں کرتا، اس کی مدد اللہ کرتا ہے۔ وہ ایسا رزق دینے والا ہے کہ پتھر میں رہنے والے کیڑے کو پتھر میں ہی رزق پہنچاتا ہے۔ وہ کسی کو بھوکا نہیں رہنے دیتا۔ آدمی کو اس کے آگے ہاتھ اور جھولی پھیلانی چاہیے۔ وہی دینے والا ہے......"

اختر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین ہوگیا کہ نہ وہ بھوکا رہے گا اور نہ ہی مرے گا۔ اس کے جسم میں طاقت سی آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھوپ کی رنگت پیلی پڑگئی تھی۔ سورج نے مغرب کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔

اختر کے قدم خود بخود اٹھنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی اس کے اندر بیٹھا اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ایک طاقت تھی جو اس کی ٹانگوں میں سما گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن یہ یقین تھا کہ وہ بہتری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی مدد کر رہا ہے۔

وہ چلتا رہا.... چلتا چلا گیا۔ اسے احساس تھا کہ اندھیرا ہو گیا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک ٹانگوں میں طاقت ہے' وہ چلتا رہے گا۔

اسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ پیر الٰہی بخش کالونی میں جا پہنچا ہے۔ اس نے تو یہ دیکھا کہ ایک بڑا بس اسٹاپ ہے' جہاں بسیں ترتیب سے قطار لگائے کھڑی ہیں۔ ایک طرف ایک ٹھیلے والا کھیر بیچ رہا ہے۔ ایک جانب بن کباب بک رہے ہیں۔ سیدھی سڑک پر چلتا رہا۔ وہ بازار تھا.... اور وہاں ہجوم بہت تھا۔

اچانک اس پر کمزوری کا ایسا حملہ ہوا کہ ٹانگیں جیسے پانی ہو گئیں۔ وہ گرتا گیا۔ اس کے حواس بھی جواب دے رہے تھے۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

○

ریاض احمد کو مایوسی ہوئی۔ گوشت کی کوئی دکان کھلی نہیں تھی۔ گوشت ختم ہو چکا تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ گوشت ملنا اب ناممکن ہے۔ جس کے ہاں قربانی نہیں ہوتی' وہ احتیاطاً" عید سے ایک دن پہلے گوشت خریدتے ہیں اور زیادہ خریدتے ہیں تاکہ گوشت آنے سے پہلے ہی گھر میں مہمانوں کی تواضع کے لئے کچھ پکایا جا سکے۔ اس لیے عید اور بقرعید سے ایک دن پہلے دودھ اور گوشت عنقا ہو جاتا ہے۔

وہ مایوس ہوئے لیکن بچوں کا خیال آیا تو انہوں نے سوچا کہ آخری حد تک کوشش کر لی جائے۔ وہ بس میں بیٹھے اور لیاقت آباد مارکیٹ چلے گئے۔ وہاں صرف دو دکانیں ایسی تھیں' جن پر گوشت موجود تھا' اور گاہک اتنے تھے کہ گوشت والا پاگل ہوا جا رہا تھا۔

وہ بھی امید باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں صرف آوازوں سے کام چل رہا تھا۔

کلو گوشت پہلوان بغیر ہڈی کا۔ ہاں بھئی' چار کلو میرا ہے۔ ڈیڑھ کلو اس ران میں سے نکال دے یار۔ گوشت والا بہت تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔

ریاض احمد بھی گوشت کے اس اسٹاک ایکسچینج میں اپنی آواز لے کر شامل ہو گئے۔ بھائی ..... آدھا کلو گوشت دے دیجئے ان کی آواز اور لہجہ سب سے جدا تھا مگر وہاں دو کلو اور چار کلو کے مطالبے ہوں' وہاں آدھا کلو کی آواز کون سنتا ہے۔ ریاض احمد کو خود بھی شرمندگی ہونے لگی۔ بچوں کی محبت نہ ہوتی تو وہ کان دبا کر وہاں سے نکل لیتے لیکن بچوں کی خاطر وہ ..... بھائی' ایک آدھا کلو گوشت مجھے دے دیجئے کی صدائیں لگاتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گوشت ختم ہوگیا۔

وہ دوسری دکان کی طرف لپکے لیکن وہاں گوشت پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔

انہیں مایوسی ہوئی لیکن انہوں نے خود کو دلاسا دیا کہ اگلے روز تو بقرعید ہے گوشت ہی گوشت ہوگا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ بچوں کو سرپرائز دینے کی نیت کی گئی تھی۔ انہیں بتایا نہیں گیا تھا ورنہ انہیں مایوسی ہوتی۔

وہ بس میں بیٹھے اور پی آئی بی کالونی پہنچے۔ مغرب ہوئے کچھ دیر ہوچکی تھی۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ بس اسٹاپ سے گھر کی طرف چل دیے۔ ہجوم بہت زیادہ تھا۔ بازار میں شاپنگ، زوروں پر تھی۔

اچانک دو قدم آگے انہوں نے ایک بچے کو یوں ڈھیر ہوتے دیکھا جیسے اس کی ٹانگیں بے جان ہوگئی ہوں۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے اسے سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ انہیں فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ بچہ بے ہوش ہوگیا ہے۔

اتنے میں لوگ جمع ہونے لگے "کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ چلتے چلتے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔" ریاض احمد نے بتایا "ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ریاض احمد نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں وہ سات سال کا بچہ لگتا تھا لیکن چہرے سے زیادہ عمر لگتی تھی۔ صحت وزن سات سال کے بچے جتنا بھی نہیں تھا۔

سامنے ہی ڈاکٹر اسد کا مطب تھا۔ ریاض احمد اسے وہاں لے گئے۔ وہاں خاصا رش تھا۔ ان کے کہنے پر ڈاکٹر نے ایمرجنسی سمجھ کر بچے کا معائنہ کیا۔ اس نے بچے کا

پیٹ دیکھا "یہ بیمار نہیں ہے۔"

"جی؟" ریاض احمد کو حیرت ہوئی۔

ڈاکٹر نے قمیض اٹھا کر بچے کا پیٹ انہیں دکھایا "یہ نجانے کب سے بھوکا کمزوری سے بے ہوش ہوگیا ہے۔"

"اوہ!"

"اسے کھلائیں پلائیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے ..... پرخیال لہجے میں "مگر احتیاط کیجئے گا۔ ایک دم سے کھانا کھلایا تو طبیعت بگڑ بھی سکتی ہے۔ بہتر ہے پہلے دودھ میں گلوکوز یا کمپلان ملا کر دیجئے۔"

"بہت بہتر ڈاکٹر صاحب۔ کیا پیش کروں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے کہ کچھ لوں۔ ویسے یہ بچہ آپ تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ یہ سڑک پر چلتے چلتے گر گیا تھا۔"

"بس میری ہدایت پر عمل کیجئے۔ اللہ آپ کو اجر دے گا۔"

وہ اسے گود میں اٹھائے مطب سے نکلے ہی تھے کہ بچے کو ہوش آگیا۔ خود ریاض احمد کی گود میں پاکر وہ حیران ہوا اور کسمسانے لگا۔ "اتار دوں تمہیں؟ چل گے؟" ریاض احمد نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

بچے نے نقاہت سے سر ہلا دیا۔

ریاض احمد نے اسے گود سے اتار دیا "بیٹے ..... تمہارا نام کیا ہے؟"

"اختر!"

"کہاں رہتے ہو؟"

اختر کی آنکھوں میں آنسو آگئے "یتیم خانے میں رہتا تھا جی۔ اب بے گھر ہوں۔"

"میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

اختر نے ممنونیت سے انہیں دیکھا اور سر ہلایا۔ اللہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ کرامت بابا کی بات ٹھیک تھی۔

اب ریاض احمد کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ ان کے پاس پچاس روپے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ سیخ کباب اور بوٹیاں گھر لے جائیں گے تاکہ بچے خوش ہو جائیں مگر اب اصولاً انہیں دودھ اور گلوکوز کا ڈبا لینا تھا۔ کمپلان کی تو گنجائش نہیں تھی۔ ایک لمحے کو انہوں نے سوچا کہ بچے کو کماٹا بھی کھلایا جاسکتا ہے۔ کباب اور بوٹیاں بھی لے لی جائیں پھر انہیں ڈاکٹر کی تنبیہہ یاد آئی۔ ان کے قدم دودھ کی دکان کی طرف اٹھ گئے۔ آگے جنرل اسٹور سے انہوں نے گلوکوز کا ڈبا خرید لیا۔

وہ گھر پہنچے تو سلمیٰ بیگم ان کے ساتھ اختر کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ریاض احمد نے انہیں دودھ میں گلوکوز ملا کر لانے کی ہدایت کی۔ بچے کے پیٹ میں کچھ پڑنے سے پہلے وہ اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے تھے۔

اختر نے دودھ بے حد شکر گزاری سے پیا۔ اس دوران ریاض احمد نے بیوی کو اس کے بارے میں بتایا۔

○

باجی نے حساب سے مہینے بھر کے بادام، پستے اور اخروٹ کی گری چندو کے سامنے رکھ دی۔ چندو نے بڑی رغبت سے منہ مارا پھر منہ چلاتے ہوئے اس نے ہلکی سی "میں" کی جیسے اس عنایت خسروانہ کا سبب جاننا چاہتا ہو۔

باجی نے اسے لپٹا لیا "جی بھر کے کھاؤ چندو بیٹے۔ آج ماں تیری تواضع کرسکتی ہے۔ یہ سب تیرا ہی ہے۔ مہینے بھر کا ایک دن میں کھالے۔"

لیکن چند زیادہ کھانے پر آمادہ نہیں تھا۔ شاید اسے پچھلی سزا یاد آرہی تھی۔

باجی رونے لگیں "کھالے بیٹے! اب میں تجھے کبھی نہیں ماروں گی۔"

چندو انہیں پیار کرنے لگا پھر ان کے کہنے پر وہ اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے پر تیار ہوگیا۔

"چندو .... کل تو مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی میری جان؟" باجی کے لئے آنسو روکنا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

چندو نے کھاتے کھاتے سر اٹھا کر باجی کی آنکھوں میں دیکھا۔ باجی کو اس کی

آنکھوں میں اداسی نظر آئی۔ اس لمحے باجی کو یقین ہوگیا کہ سمجھ دار چندو یہ بھی سمجھ گیا ہے کہ اسے قربان کیا جانے والا ہے اور یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

"ہاں چندو ..... میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں اللہ سے جنت مانگوں گی اور اس کے کرم سے جنت مل گئی تو تجھے بھی مانگوں گی۔"

اس بار چندو نے ڈرائی فروٹ سے منہ پھیر لیا۔ وہ باجی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کی نمی بے حد واضح تھی۔ پھر اس نے آنکھیں موندلیں۔

بھائی جان کمرے سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ ان کا دل بوجھل تھا۔ یہ سچ ہے کہ بیوی کے مقابلے میں ان کی محبت کمتر تھی مگر پھر بھی انہوں نے چندو کو بیٹے ہی کی طرح چاہا تھا۔ اب بیوی نے اسے قربانی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ کس دل سے کیا ہے' تو وہ رکاوٹ بننا نہیں چاہتے تھے۔ حالاں کہ ایک بار ان کے جی میں آئی تھی کہ چندو کو لے کر کہیں دور بھاگ جائیں۔

بھائی جان دکھی تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ یہ دکھ روگ نہ بن جائے۔ مردوں کا دکھ سے لڑنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ بھائی جان کا دفاع یہ تھا کہ چندو کی قربانی کے خیال کو تسلیم کرنے کے بعد وہ اس سے دور ہوگئے تھے۔ انہوں نے بے تعلقی اختیار کرلی تھی۔ باجی جیسے چندو کو لپٹائے بیٹھی تھیں' یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو چندو کے جانے سے پہلے ہی اسے بھول جانے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے تھے۔

وہ کمرے کے دروازے سے ہٹ آئے اور کرسی پر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالاں کہ ان سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد باجی کمرے میں آئیں "چندو کو سب پتا ہے۔ وہ بادام پستے بھی نہیں کھا رہا تھا۔ اس نے سر ڈال دیا ہے۔"

"ہاں شمسہ بیگم' جانوروں کو سب معلوم ہوتا ہے۔ اسے تو رات بھر قصائی اور چھری نظر آئیں گے۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا لیکن چندو کو جانور کہتے ہوئے ان کے دل پر گھونسا سا لگا تھا مگر وہ اس کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

باجی انہیں شکایتی نظروں سے دیکھتی رہیں لیکن ان کی نظریں کتاب سے نہیں ہٹیں۔

○

سلمی بیگم تو اختر سے پوچھ گچھ کرنا چاہتی تھیں لیکن ریاض احمد نے انہیں منع کردیا۔ بچے کا پیٹ بھرنے سے پہلے وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس دوران بچے اختر سے مانوس ہونے کے مرحلے میں داخل ہوگئے تھے۔ اشعر تو اسے اپنے برابر کا ہی سمجھ رہا تھا۔ ویسے قد کاٹھ میں وہ تھا بھی اختر جتنا۔ اختر سائیکل کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "چلیں .... سائیکل سے کھیلیں؟" اشعر نے اختر کو دعوت دی۔

اختر کے لئے تو وہ بڑی نعمت تھی۔ وہ فوراً" رضا مند ہوگیا "پہلی باری میری۔" فیاض نے کہا۔ چھوٹا ہونے کے ناتے یہ اس کا حق تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے بعد اختر سائیکل چلائے گا۔"

اختر نے پہلی بار سائیکل چلائی۔ اسے ایسا لطف آیا کہ سائیکل چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا مگر کچھ دیر بعد سلمی بیگم نے آواز لگائی "میز پر آجاؤ۔ کھانا لگ گیا ہے۔"

بچوں نے ہاتھ دھوئے تو اختر نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کئے۔ کرسی پر بیٹھنا بھی اس کے لئے نئی بات تھی مگر ریاض احمد کے بچوں سے اسے حوصلہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

وہاں ہر چیز اسے نرالی لگی۔ سالن دو بڑی قابوں میں رکھا تھا۔ پتلی نفیس چپاتیاں دستر خوان میں لپٹی تھیں۔ تو ایسا ہوتا ہے گھر؟ اس نے سوچا' اور دل ہی دل میں اللہ سے شکوہ کیا "مجھے کیوں ایسا گھر نہیں ملا؟"

"لو بیٹے' سالن نکالو۔" سلمی بیگم نے اس کی طرف قاب بڑھائی۔ اس میں سالن نکالنے والا چمچہ بھی تھا۔

اختر نے سالن کو دیکھا۔ وہ دال کی طرح کی چاکلیٹی رنگ کی کوئی چیز تھی۔ گوشت بہرحال نہیں تھا۔ اسے اپنا عہد یاد آگیا "میں تو گوشت کھاؤں گا۔" اس نے کہا۔

فیاض نے فوراً" تائید کی "میں بھی ....."

سلمی بیگم اور ریاض احمد نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اب کیا کریں؟ یہ آنے والا بچہ بھی ..... بچے اب اختر کو اور زیادہ اپنائیت سے دیکھ رہے تھے۔

"اختر ..... کھا کر تو دیکھو۔ بہت مزے کا سالن ہے۔" میمونہ بولی۔ سلمی کی نگاہوں سے فخر جھلکنے لگا۔

"ہاں۔ یہ لوبیا ہے۔" اشعر نے کہا "اس میں پروٹین گوشت سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔"

"کل جی بھر کے گوشت کھالینا۔" میمونہ نے کہا۔

اختر پہلے ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ ایسی اپنائیت کا برتاؤ کیا گیا تھا اور وہ یہ کر رہا تھا۔ اس نے پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا۔ سب لوگ کھانا کھانے لگے۔ اختر پہلے ہی نوالے پر حیران رہ گیا۔ اتنے مزے کا تو اس نے کبھی گوشت بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے بہت اچھی طرح کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد ریاض احمد آنگن میں چہل قدمی کرتے رہے۔ بچے کھیلنے لگے۔ سونے کا وقت آیا تو بچوں نے ریاض احمد کو گھیر لیا۔ "ابو" کہانی سنائیں۔"

"بھئی آج اختر سے اس کی کہانی سنیں گے۔" ریاض احمد نے کہا۔

بچوں کو مایوسی ہوئی لیکن انہوں نے ضد نہیں کی۔

"ہاں بھئی اختر اب اپنے متعلق بتاؤ۔"

اختر نے انہیں سب کچھ سنا ڈالا۔ بچے حیرت سے سن رہے تھے۔ شاہ جی کی مار کے متعلق سن کر وہ سہم گئے۔ وہ ان کے لئے ایسا ایڈونچر تھا جو جنوں اور پریوں کی کہانی سے کم نہیں تھا۔ ریاض احمد اور سلمی بیگم کن انکھیوں سے اپنے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بچے یہ کہانی کبھی نہیں بھولیں گے۔

"اور یہ سب کچھ گوشت کی وجہ سے ہوا؟" سلمی بیگم نے تبصرہ کیا۔

"میں صرف ایک بوٹی مانگ رہا تھا باجی۔" اختر نے صفائی پیش کی۔

"دنیا بڑی ظالم ہے۔" ریاض احمد بولے۔

"تم نے کب سے گوشت نہیں کھایا ہے اختر؟" سلمی بیگم نے خاص طور پر

اپنے بچوں کو سنوانے کی غرض سے پوچھا۔

"باجی' میں نے پچھلے سال بقر عید سے بھی پہلے گوشت کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک نہیں کھایا۔" اختر نے بتایا۔

"دیکھا تم لوگوں نے۔" سلمی بیگم اپنے بچوں کی طرف مڑیں۔ "تمہیں تو اتنے سے دن ہوئے تھے۔ اس بے چارے کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے گوشت کھائے ہوئے۔"

بچوں کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے۔

ریاض احمد کے اشارے پر سلمی بیگم بچوں کو سلانے کے لئے لے گئیں۔

ریاض احمد نے اختر سے پوچھا "اب تم کیا کرو گے بیٹے؟"

"میں کیا کروں گا۔ میں یتیم ہوں جناب ...."

"تم یتیم کو کیا سمجھتے ہو۔" ریاض احمد نے اس کی بات کاٹ دی "تمہیں پتا ہے ہمارے پیارے نبیؐ بھی یتیم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا میں اجالا کر دیا۔ دنیا کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا آپ نے۔ جانتے ہو' اللہ یتیموں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ ان کی مدد کرتے ہیں ...."

"میں جانتا ہوں جناب! اللہ نے میری مدد کی ہے ورنہ میں مرجاتا۔ مگر میں بھیک مانگنے کے سوا کیا کرسکتا ہوں اور میں بھیک نہیں مانگنا چاہتا۔"

"تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ سب کچھ کرسکتے ہو اور انشاء اللہ کرو گے۔ دیکھو بیٹے' ہم کچھ دنوں میں اپنے گھر جائیں گے۔ یہ گھر ہمارا نہیں۔" ریاض احمد نے اسے اپنے متعلق بتایا "میں تمہیں اپنے گھر میں ایک علیحدہ کوارٹر دوں گا۔ تم اسکول میں داخلہ لینا اور پڑھنا۔ میرے زور پر نہیں اپنے زور پر۔ ہم کوشش کریں گے کہ تم ادھر ادھر کے گھروں میں اخبار ڈال کر خود پیسہ کماؤ۔ خود اپنی تعلیم کا خرچ اٹھاؤ۔ کھانا تمہیں گھر سے مل جائے گا۔ اخبار والی بات نہ بنی تو تم اسکول سے واپس آنے کے بعد دکان پر میرا ہاتھ بٹا دینا۔ تمہیں اس کی تنخواہ ملے گی۔ پھر دیکھنا' تمہارے پاس پیسے جمع ہوتے رہیں گے۔ تم ایک دن بڑے آدمی بنو گے۔"

اختر کی آنکھیں امید کے ستاروں سے بھر گئیں۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ

کچھ ہے... اور بہت کچھ بن سکتا ہے۔

"اس وقت تک تم یہیں رہو۔"

اختر کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اسے اصغر کا خیال آگیا۔ پتا نہیں، وہ کہاں ہوگا۔ اس نے کھانا بھی کھایا ہوگا یا نہیں۔

"کیا بات ہے؟" ریاض احمد نے تبدیلی نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب، آپ اس کوارٹر میں اصغر کو بھی جگہ دے دیں گے نا؟"

"لیکن اصغر تو تم سے بچھڑ گیا ہے.... کھو گیا ہے۔"

"وہ مل جائے گا صاحب۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ریاض احمد سمجھ رہے تھے۔ دنیا میں اختر کا اب تک ایک ہی رشتہ تھا..... اصغر۔ وہ واقعی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا "کیسے ملے گا اصغر تمہیں؟ اتنے بڑے شہر میں...."

"صاحب، وہ عید کی تیسری رات اس فوارے اور روشنیوں والی چورنگی پر ضرور آئے گا۔ کانسٹیبل نے ہم سے کہا تھا...."

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ چلو، اب سو جاؤ۔"

سلمیٰ بیگم نے اسے لے جاکر سونے کی جگہ دکھا دی۔ اختر کو کبھی بستر نہیں ملا تھا۔ کہاں ایسا نرم گرم اور آرام دہ بستر۔ طویل جسمانی تکلیفوں، بے آرامی اور تھکن کے بعد آرام ملا تو اس کی آنکھوں میں نیند ہی نہیں، خواب بھی اتر آئے۔ لمحوں کے اندر وہ ایسا بے خبر سویا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ سلمیٰ بیگم نے اس کا ناپ لیا تھا۔

ریاض احمد نے بیوی کو کپڑے پھیلائے بیٹھے دیکھا تو بولے "یہ آدھی رات کو کیا لے بیٹھیں آپ؟"

"اشعر کی پینٹ ذرا سی کھول لوں تو اختر کو آجائے گی۔ جوتے بھی موجود ہیں۔ یتیم بچہ عید کے دن کپڑوں سے تو محروم نہ رہے۔"

ریاض احمد مسکرا دیے "سلمیٰ بیگم، آپ بہت اچھی ہیں۔"

○

رات ہوئی تو اصغر کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ بھوک الگ بے چین کر رہی تھی۔ وہ

پھرتا پھرا۔ اختر اسے کہیں نہ ملا۔ بھوک سے بے تاب ہو کر جب بھی وہ کسی سے سوال کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے خیال آجاتا کہ انہوں نے کسی سے کچھ نہ مانگنے کا ارادہ کیا ہے۔

اس کے قدم خود بخود اس ریسٹورنٹ کی طرف اٹھ گئے' جہاں گزشتہ رات اس نے کھانا کھایا تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے سیٹھ سے سوال نہیں کیا۔ بس سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس بار اس نے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا لیکن سیخوں پر بھنتے ہوئے گوشت اور کبابوں کی بو اسے پاگل کیے دے رہی تھی۔

سیٹھ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اسے پکارا "اے لڑکے... ادھر آ۔"

اصغر اس کے پاس چلا گیا۔

"کھانا کھائے گا؟"

اصغر نے سر جھکائے جھکائے اثبات میں ہلایا۔

"وہ دوسرا لڑکا جو تیرے ساتھ تھا' جو گوشت مانگ رہا تھا' وہ کہاں گیا؟"

"بھیڑ میں گم ہو گیا۔" اصغر کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز رندھ گئی۔

"رات اس نے کھانا کھایا تھا؟ گوشت ملا اسے؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"نہیں سیٹھ۔ گوشت نہیں ملا اسے اور وہ بہت ضدی ہے۔ دوپہر تک اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔"

سیٹھ کو پچھتاوا ہونے لگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے فضلو کو بلایا "اسے سبزی اور روٹی لا کر دے بیٹا!" اس نے سوچا' دوسرا لڑکا ہوتا تو آج انہیں گوشت ہی کھلا دیتا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ لڑکے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ انہیں گوشت کھلا دیتا تو اس کا کیا جاتا۔ مگر لڑکے نے مانگا کتنی دھونس سے تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ اس سے کیا ہوتا ہے' دل نے کہا۔ اس کے باوجود اسے گوشت مل جاتا تو اللہ کتنا خوش ہوتا۔ سیٹھ جھنجلا رہا تھا۔ اس جھنجلاہٹ میں اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سبزی کا سن کر لڑکے کی آنکھیں بجھ گئی ہیں۔ سیٹھ تو اس لڑکے کا تصور کر رہا تھا' جو اتنے بڑے شہر میں گوشت مانگتا پھر رہا ہوگا۔ کیا سب لوگ وہی کریں گے' جو اس نے کیا

تھا۔ یا کوئی اللہ کا بندہ اس بے سہارا یتیم کی خواہش پوری کر دے گا؟ یہ سوال اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔

اصغر نے کھانا کھایا اور اسی طرف چل دیا' جہاں گزشتہ رات وہ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں دری تھی۔

چورنگی پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اختر اسے بہت یاد آرہا تھا۔ اس نے دری بچھائی اور لیٹ گیا مگر نیند آنے کے باوجود اس سے سویا نہیں جا رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ پولیس والے نے دہشت گردوں کی بات کی تھی۔ اسے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ دہشت گرد کیا ہوتے ہیں۔

اسے امید تھی کہ پولیس والا آئے گا۔ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ یہ خیال اسے دھیرے دھیرے تھپک کر سلانے لگا۔ سونے سے پہلے ایک بے حد خوش کن خیال نے اسے چونکا دیا۔ اختر اسے دوبارہ مل سکتا تھا..... اسی جگہ..... عید کی تیسری رات۔ ہاں..... وہ دونوں مل جائیں گے مگر اس وقت تک وہ کیا کرے گا؟ پھر نیند نے اسے ہر فکر سے بے نیاز کر دیا..... نیند جو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے!

○

کسی بہت پیارے کی جدائی کا مرحلہ در پیش ہو اور اس کے ساتھ آخری رات رہ گئی ہو تو نیند نرم گرم بستر پر بھی نہیں آتی۔ باجی کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ چندو ہمیشہ کی طرح ان سے لپٹ کر سو رہا تھا مگر وہ جاگ رہی تھیں۔ انہیں چندو کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ جب سے چندو ان کے پاس تھا' اس وقت سے اب تک کا ایک ایک دن ان کی نظروں میں پھر گیا۔ آنکھوں سے برسات ہوتی رہی۔ دل میں ایک ایسا درد تھا' جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی تو انہیں لگتا کہ ان کا دم گھٹ جائے گا اور وہ مر جائیں گی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس رات کی صبح کم از کم وہ نہیں دیکھ سکیں گے۔

صبح ہوگئی اور ان کی پلک تک نہیں جھپکی لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھیں۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ سو رہی ہیں۔ وہ اٹھنا ہی نہیں چاہتی تھیں لیکن چندو اس روز خلاف معمول ذرا جلدی اٹھ گیا اور اس نے تکلف بھی نہیں کیا۔ وہ معمول کے مطابق انہیں جگانے کی کوششوں میں مصروف ہوگیا مگر اس صبح وہ اٹھنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ چندو کچھ زیادہ ہی بے صبرا ہو رہا تھا۔..... نجانے کیوں؟"

"ارے چندو' آج سو اور جتنا ہوسکتا ہے سو۔" باجی نے جھنجھلا کر کہا "اور مجھے بھی سونے دے۔ تجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"اے سب معلوم ہے۔" بھائی جان بولے۔ باجی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی نجانے کب سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر باجی کو اندازہ ہوگیا کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔

چندو پیچھے پڑگیا تھا۔ باجی کو اٹھنا ہی پڑا۔

زندگی کا معمول شروع ہو گیا مگر کچھ معمولات ایسے تھے' جو آخری بار ادا کیے جا رہے تھے..... اور وہ سب چندو سے متعلق تھے۔ باجی نے بادام پستے اور اخروٹ چندو کے سامنے رکھ دیے' جن سے اس نے گزشتہ روز منہ پھیرلیا تھا۔ اس نے اب بھی منہ پھیرلیا۔

"کھالے رے چندو۔ کھالے میرے بیٹے۔"

لیکن چندو نے ان چیزوں کو منہ بھی نہیں لگایا۔ وہ باریک آواز میں چھوٹی سی میں میں کرتے ہوئے ان کے گھٹنوں سے سر رگڑ رہا تھا۔

"شہسہ' آپ کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔" بھائی جان نے تلخ لہجے میں مداخلت کی "چندو ہر چیز اس طرح چاہتا ہے' جیسے روز ہوتی ہے۔"

باجی نے سات بادام' سات پستے اور اخروٹ کی گری کے تین دانے چندو کے سامنے رکھے۔ چندو نے کھالیے۔ باجی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

باجی نے شوہر کے نہانے کے لئے گرم پانی دیا اور پھر چندو کے نہانے کا اہتمام کرنے لگیں۔ انہوں نے پانی کی بالٹی میں عرق گلاب ملایا اور اس سے چندو کو اچھی طرح نہلایا۔ اس روز چندو صرف عرق گلاب ملے پانی سے نہیں نہایا تھا۔ اس کے جسم پر باجی کے آنسوؤں کی دھاریں بھی پڑی تھیں۔

چندو کو نہلا کر باجی نے اس کا جسم تولیے سے اچھی طرح خشک کیا پھر انہوں نے اس کے بالوں اور سینگوں پر اچھی طرح عطر ملا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے واسکٹ پہنائی۔ وہ بھی عطر میں بسی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کے لئے خاص طور پر سرخ ٹوپی سی تھی۔ وہ انہوں نے اس کے سر پر رکھ دی۔

اس روز چندو کی سج دھج دیکھنے والی تھی اور شاید چندو کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس کی چال میں اس روز وہ بانکپن اور مستی تھی' جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ باجی نے اس کی بلائیں لیں اور لپٹا کر رونے لگیں "چندو خدا کی قسم' میں خود غرض نہیں میرے بیٹے..... یہ سب اللہ کے لیے ہے..... ہے نا؟"

چندو نے اوپر نیچے سر ہلایا اور انہیں پیار کرنے لگا۔

بھائی جان باتھ روم سے تیار ہو کر نکلے تو اسے دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے

آنسو ضبط کئے "میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔" انہوں نے کہا پھر منہ پھیر کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ باجی اٹھ کر ان کے پیچھے دروازے تک آئیں "سنیں .... ذرا قسائی کو کہہ دیجئے گا۔" انہوں نے لجاجت سے کہا۔

"میں نہیں کہوں گا۔ یہ کھیل آپ کا ہے۔ آپ ہی کھیلیں۔" بھائی جان کو غصہ آرہا تھا۔

"کیوں میرا دل چھیدتے ہیں۔ یہ کھیل نہیں۔ اللہ کے حضور قربانی پیش کی جا رہی ہے۔" باجی نے گلوگیر لہجے میں کہا "ٹھیک ہے۔ میں گلی میں کسی سے کہہ دوں گی۔"

بھائی جان کو یہ بھی گوارا نہیں تھا "اچھا .... کہہ دوں گا۔" انہوں نے کہا اور باہر نکل گئے۔

باجی نے واپس آکر چندو کو محبت سے لپٹایا "جاؤ بیٹے' اب جا کر سب لوگوں سے عید مل آؤ۔ خدا حافظ کہہ دو سب کو۔"

چندو ہٹنا نہیں چاہ رہا تھا مگر باجی نے دوبارہ کہا تو وہ باہر چلا گیا۔

چندو باہر نکلا تو سب سے پہلے حسینہ کے گھر گیا۔ ہر جگہ مرد اور بچے اس سے عید ملے۔ عورتوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ عیدی کے پیسوں سے اس کی واسکٹ کی جیبیں بھر گئیں۔ عید مبارک چندو .... کیسے ہو۔ آؤ' عید مل لو .... ہر طرف یہی صدائیں تھیں۔

یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ چندو کی قربانی ہونے والی ہے!

○

اصغر کی رات جیسے تیسے گزر گئی۔ سوتے جاگتے۔ وہ کچھ دیر سوتا اور پھر چونک کر جاگ اٹھتا۔ ہر بار اسے لگتا کہ کوئی دہشت گرد اسے ختم کرنے کے لئے آگیا ہے اور اس کے سر پر کھڑا ہے۔ ایک بار وہ سردی کے احساس کی وجہ سے اٹھا۔ وہ صبح کے قریب کا وقت تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے بچھی ہوئی دری کا ایک حصہ اوڑھ بھی لیا مگر دوبارہ سونے سے پہلے اسے یہ خیال ضرور آیا کہ اختر کو بھی ایسے ہی سردی لگی

ہوگی۔

اس کے ذرا بعد وہ پوری طرح بیدار ہوگیا۔ اس نے فوارے کے پانی سے کلیاں کیں اور منہ دھویا پھر وہ دری اوڑھ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی پورا شہر دیر تک سوئے گا۔ وہ چائے والے کا منتظر تھا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے وہ بغیر مانگے اسے چائے..... بلکہ بسکٹ بھی کھلا دے۔ یہ وقت بہرحال اس کے لئے کوفت کا تھا۔

اصغر کو یاد ہی نہیں تھا کہ وہ بقرعید کا دن ہے!

اچانک نہائے دھوئے ہوئے' نئے کپڑے پہنے ہوئے' اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے لوگ جوق در جوق سڑک پر آئے تو پہلے تو اصغر کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی مگر چند لمحوں میں ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ بقرعید کا دن ہے۔

اس نے سڑک پار کی اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ بچوں کو وہ خاص طور پر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا لیکن جلد ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے احساس ہوگیا کہ وہ شامل ہوکر بھی اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوسکا ہے۔ وہ سب سے الگ اور نمایاں نظر آرہا ہے۔ اور وہ بھی اچھے معنوں میں نہیں' برے معنوں میں۔ تمام بچوں نے نئے خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پیروں میں چمچماتے نئے جوتے' چپلیں اور سینڈل تھے۔ سب خوشبو میں نہائے ہوئے تھے۔ اتنے لوگوں کی خوشبوئیں مل جل کر ہوا میں شامل ہو رہی تھیں۔ پوری فضا مہک رہی تھی۔ لگتا تھا' خوشبو لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

ضرورت تو نہیں تھی کہ وہ اپنے کپڑوں کو دیکھتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پیوند لگے کپڑے بہت میلے ہوگئے ہیں۔ دو دن دو رات سے تو وہ شہر میں آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس سے بھی کئی دن پہلے یتیم خانے میں اس نے وہ کپڑے پہنے تھے۔

پھر اس نے سر جھکا کر خود کو دیکھا۔ کپڑے بے حد میلے تھے۔ کسی کسی جگہ سے تو چیکٹ ہو رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے بدبو بھی آرہی ہوگی مگر اس بدبو کا پردہ عطروں کی خوشبو نے رکھ لیا ہے اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ پاؤں ابھی کچھ دیر پہلے اس نے فوارے کے پانی میں رگڑ رگڑ کر دھوئے تھے لیکن اتنی ہی سی دیر میں ان پر پھر میل آ گئی تھی۔

اصغر کو اچانک احساس ہوا کہ ہر شخص اسے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اسے اس بھیڑ میں شامل ہونے کا ان لوگوں کے ساتھ چلنے کا کوئی حق نہیں۔ شرمندگی اور کم تری کے احساس نے اس کے جسم کو شل کر کے رکھ دیا۔ اس کے قدم پہلے بوجھل ہوئے، پھر سست اور وہ ایک طرف ہو گیا۔ رک گیا۔ چند لمحوں میں اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگا۔

لوگ آگے نکلے جا رہے تھے۔ قدموں کی رفتار تیز تر ہو رہی تھی۔ مسجد یا عید گاہ سے اعلان ہو رہا تھا کہ نماز ہونے والی ہے۔ اصغر چاہتا تھا کہ وہ ان سب سے پیچھے ..... اور اکیلا رہ جائے لیکن وہ ہجوم تو بہتا دریا تھا.... موج در موج.....

"ابو بھئی، میں تو عیدی لوں گا.... دس روپے۔" اس کے کان میں ایک بچے کی آواز پڑی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور اپنے باپ کی انگلی تھامے چلا جا رہا تھا "دیں نا ابو۔"

"دس نہیں، میں بیس دوں گا اپنے بیٹے کو۔" بچے کے باپ نے کہا "لیکن نماز کے بعد۔ عیدی نماز کے بعد ملتی ہے بیٹے۔"

اصغر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حقیر کر دینے والے ہجوم سے کیسے جان چھڑائے۔ اسی وقت ایک ویگن وہاں آ کر رکی "آؤ بھئی، نیو کراچی۔ گودھرا، نالہ، مدینہ کالونی، پانچ نمبر، سندھی ہوٹل کالا اسکول.... آؤ بھئی۔" کنڈیکٹر آواز لگا رہا تھا۔

اصغر کو کسی جگہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس وہ اس وقت اس بھیڑ سے نکل لینا چاہتا تھا۔ وہ ویگن کی طرف بڑھا مگر فوراً ہی اس کے پاؤں رک گئے۔

"جائے گا بھئی؟" کنڈیکٹر نے پوچھا۔

اصغر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آجانا۔"

"پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔"

کنڈیکٹر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا "آجا.... آج تو عید کا دن ہے۔ نماز کے بعد سواریاں ملیں گی تو تلافی ہو جائے گی۔"

اصغر ویگن میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں صرف دو مسافر تھے۔ اس لیے وہ اسے

آغوش مادر کی طرح مہربان لگی ..... وہاں سر جھکانے' نظر چرانے اور شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی اور یہاں بیٹھ کر وہ سکون سے سوچ سکتا تھا۔

تو یہ ہوتی ہے عید! اس نے سوچا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے' میری عید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یتیم خانے میں بڑی عافیت تھی۔ ان باتوں کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ یتیموں کی عید یتیم خانے ہی میں بھلی۔ اس نے سوچا۔ یہاں تو عید کے لئے بہت کچھ چاہیے جو یتیموں کے پاس نہیں ہوتا۔ ایک گھر ہو' جہاں آدمی نہا دھو سکے اور سو سکے۔ آسمان کے نیچے فٹ پاتھ پر سونے والے کی کیا عید۔ پھر ماں ہو جو کپڑے سیئے۔ یا انگلی پکڑ کر عید کے کپڑے اور دوسری چیزیں دلائے۔ باپ ہو' جو انگلی پکڑ کر عید کی نماز کے لئے لے جائے۔ پھر نماز کے بعد عیدی دے۔ جس کے پاس یہ سب کچھ نہ ہو' وہ یتیم خانے چلا جائے۔

وہ سوچے چلا جا رہا تھا!

○

اختر بے سدھ سویا ہوا تھا۔ اسے ریاض احمد نے جگایا۔ ان کے بچے بھی اسی وقت سو کر اٹھے تھے۔ اختر نے اٹھنے میں ذرا سستی کی۔ وہ دوسرے کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اسے سلمی بیگم کی آواز سنائی دی "اشعر بیٹے' آپ بھول گئے کہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے بڑوں کو سلام کرتے ہیں" اس کے بعد اس نے اشعر کو شرمندگی بھرے لہجے میں سلام کرتے سنا۔

اختر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "سلام علیکم بیگم صاحب!" سلمی بیگم کپڑوں پر استری کر رہی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرائیں "ماشاء اللہ ..... بڑے تمیز دار بچے ہو۔"

اختر کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ پہلی بار کسی نے یوں اس کی تعریف کی تھی۔

"تمہیں نہانا آتا ہے؟"

"جی بیگم صاحبہ!"

وہ اسے باتھ روم میں لے گئیں۔ وہاں انہوں نے اسے نہانے والا فوارہ چلا کر

دکھایا۔ وہاں صاف ستھرا تولیا بھی تھا اور خوشبو دار صابن بھی لیکن یہ سب دیکھ کر اختر افسردہ ہوگیا۔ اس کے کپڑے بہت میلے، بہت گندے ہو رہے تھے۔

"یہ تمہارے کپڑے ٹنگے ہیں۔" سلمی بیگم نے کھونٹی کی طرف اشارہ کیا "نہا کر پہن لینا۔"

اختر نے صرف ایک نظر کپڑوں کو دیکھا اور پھر حیرت سے سلمی بیگم کو۔

"دروازہ بند کرلو۔" سلمی بیگم بولیں۔

نہانے کے بجائے اختر دیر تک ان کپڑوں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ یہ کپڑے اس کے ہیں ..... وہ پہنے گا؟ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اتنے پیارے کپڑے، وہ نہایا اور خوب جی بھر کے نہایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بدن ذرا بھی میلا ہو۔ پہلی بار اسے اتنے پیارے کپڑے ملے تھے۔

وہ نہا کر کپڑے بدل کر نکلا تو ریاض احمد اور دونوں لڑکے تیار ہوچکے تھے "ابھی یہ چپل پہن جاؤ۔" سلمی بیگم نے اختر سے کہا "واپس آکر پینٹ شرٹ پہنو گے تو میں تمہیں جوتے موزے دوں گی۔ ہاں، یہ ٹوپی رکھو سر پر۔"

وہ ریاض احمد اور ان کے بچوں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا تو سلمی بیگم کچھ مسالے کوٹ رہی تھیں "میں نے سب تیاری کرلی ہے۔ گوشت آتے ہی بھون دوں گی۔"

گوشت کا سنتے ہی اختر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ریاض احمد کے بچوں کا بھی یہی حال ہے "ہم کہاں جا رہے ہیں صاحب؟" اس نے ریاض احمد سے پوچھا۔

"مسجد .... عید کی نماز پڑھنے۔" ریاض احمد نے کہا "اور تم مجھے انکل اور ان کی امی کو انٹی کہا کرو۔"

"جی اچھا انکل!"

صاف ستھری قمیض شلوار پہن کر یوں چلنا اختر کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی۔

مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ..... اتنے لوگ ... وہاں بازار سے بھی زیادہ ہجوم

تھا۔ مولوی صاحب وعظ دے رہے تھے" اس شخص کو کچھ دینے کا ..... مدد کرنے کا اجر زیادہ ہے جو ضرورت مند ہو۔ لیکن شرم کی وجہ سے سوال نہ کرسکے۔ جسے اپنی عزت کا خیال ہو اور اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا ہو۔ اس لیے کہ سوال کرنے والا تو کسی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلا دے گا..... اور اسے مل بھی بہت جائے گا۔ یاد رکھیے جو دوسروں کا پردہ رکھتا ہے' اللہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔

"قربانی کے گوشت میں پڑوسیوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ آپ اپنا حصہ کسی کو بھی دے سکتے ہیں مگر آپ کو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ کسی کا حصہ روک کر کسی اور کو دینے کا کوئی حق نہیں۔ پڑوسی کا حق ایسا ہے کہ اگر پڑوسی بھوکا سوگیا اور آپ نے کھانا کھالیا تو اللہ آپ سے جواب طلب کرے گا اور یہ عذر قبول نہیں فرمائے گا کہ اس نے آپ کو بتایا نہیں تھا۔ پڑوسی کے حال کی خبر رکھنا آپ کی ذمے داری ہے ..... تجسس کئے بغیر۔ صرف مشاہدے کے زور پر۔ اس لئے کہ نہ بتانے پر بھی بہت کچھ کھل جاتا ہے۔ صرف احساس بیدار ہونا چاہیے۔

"غریب وہ نہیں ہوتا' جو جان بوجھ کر اپنا حلیہ غریبوں کا سا رکھے' غربت کا اعلان کرے۔ غریب وہ ہے جو اپنی محرومی چھپا کر رکھے۔ کوشش کرے کہ اس کے حال کا کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ ایسے لوگوں کو تلاش کرکے ان کی مدد کیا کریں ....."

نماز سے فارغ ہوکر سب ایک دوسرے سے عید ملنے لگے۔

واپس آتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ گلی میں دو ایک گھروں میں قربانی ہوچکی ہے۔ باقی لوگ قربانی کا اہتمام کر رہے ہیں۔ وہ گھر آگئے۔ اب وہ سب گوشت کی آمد کے منتظر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گوشت بس اب آنے ہی والا ہے۔

○

بھائی جان نماز پڑھ کر واپس آئے تو انہوں نے بیوی کو بتایا کہ انہوں نے قسائی سے بات کرلی ہے مگر وہ کہہ رہا تھا کہ آنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔ بانو یہ سن کر پریشان ہوگئیں۔ وہ اس مرحلے سے جلد از جلد گزر جانا چاہتی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ دیر لگے گی تو ان کی ہمت جواب دے جائے گی۔

"آپ قربانی تک کہیں جایئے گا نہیں۔" باجی نے کہا۔ شوہر کی سوالیہ نظروں کے جواب میں انہوں نے وضاحت کی "چھری تو آپ کو پھیرنی ہے نا۔"

"یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔" بھائی جان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"تو پھر قربانی کیا ہوئی۔ یہ تو آپ کا کام ہے۔"

"مجھ سے نہیں ہوگا۔" اس بار بھائی جان کے لہجے میں فریاد تھی "آپ سوچیں کہ اگر آپ کو یہ کام کرنا ہوتا تو کیا ہوتا۔"

"عورت کے لئے اللہ کا حکم نہیں ہے۔ لیکن اللہ جانتا ہے کہ اس کی خاطر میں یہ بھی کر گزرتی۔ اگرچہ دل خون ہو جاتا۔" باجی رونے لگیں۔

بھائی جان کو ان پر ترس آنے لگا "اچھا شمسہ بیگم! میں حوصلہ کرلوں گا۔ آپ دعا کریں۔"

اسی وقت چندو گھر میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا باجی کے پاس آیا۔ اس کے آتے ہی بھائی جان اندر چلے گئے۔ ان میں اب چندو کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

چندو آیا اور باجی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔ باجی کو اس کی واسکٹ سے نوٹ جھانکتے نظر آئے۔ انہوں نے نوٹ نکالے "ہوں .... تو تم عیدی سمیٹے پھر رہے ہو۔ کھایا پیا بھی خوب ہوگا۔" باجی جانتی تھیں کہ گلی کے سب لوگ عید اور بقر عید پر چندو کو خاص طور پر ڈرائی فروٹ کھلاتے ہیں۔

باجی نے نوٹ گنے "خوب کمائی کی ہے مگر چندو، یہ تمہارے کام کے نہیں۔ انہیں میں صدقہ کردوں گی۔"

چندو کی آنکھوں کی نمی افسانہ نہیں تھی۔

اس کے بعد چندو باہر نہیں گیا۔ وہ باجی کی گود میں سر رکھے لیٹا رہا۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہو جاتیں اور باجی اپنے آنچل کے کنارے سے پونچھ دیتیں پھر باجی نے کہا "اٹھ چندو بیٹے، ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نماز پڑھ لوں۔"

وہ نماز پڑھ کر آئیں تو دیکھا کہ چندو بے حد مضطربانہ انداز میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ ان کے پاس آیا اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ

گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ باجی بھی رونے لگیں۔
وہ عید کا دن تھا مگر صرف گھر کے لوگوں پر ہی نہیں' در و دیوار پر بھی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔

○

ویگن والے نے اصغر کو کالے اسکول پر اتار دیا۔ اصغر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں نماز ہو رہی تھی۔ مسجد کے باہر بھیک مانگنے والے جمع تھے۔ اصغر ان سے ذرا ہٹ کر سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔
لوگ نماز پڑھ کر نکلے اور حسب توفیق خیرات کرنے لگے۔ ایک صاحب نے اصغر کے پاس سے گزرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا "نہیں جی ..... میں بھیک نہیں مانگتا صاحب!" اصغر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"لے لو بیٹے۔ آج عید کا دن ہے اور یہ میں بھیک نہیں دے رہا ہوں۔"
لفظ بیٹے سن کر اصغر کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اسے وہ بیٹا یاد آیا' جو باپ سے عیدی مانگ رہا تھا۔
"تم کہاں رہتے ہو؟ ماں باپ ہیں؟" ان صاحب نے پوچھا۔
"میں کہیں نہیں رہتا صاحب! ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔"
"یہ پیسے رکھ لو۔"
"صاحب' ایک بات مانیں گے۔" اصغر نے گھگیا کر کہا "آپ مجھے پانچ روپے دے دیں ..... دو دے دیں مگر عیدی کہہ کر دیں۔"
اس کے لہجے میں کوئی چیز تھی' جس نے ان صاحب کے دل کو چھو لیا۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا ایک نوٹ نکالا اور بیس روپے اصغر کی طرف بڑھائے "لو بیٹے' یہ تمہاری عیدی ہے۔"
اصغر نے بے حد شکر گزاری سے وہ پیسے یوں لیے' جیسے کوئی مقدس چیز ہو۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"بیٹے، عیدی لے کر سلام بھی تو کرتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

اصغر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی عیدی تھی۔ اسے واقعی نہیں معلوم تھا۔ اس نے سلام کیا۔ وہ صاحب بولے۔ "جیتے رہو بیٹے۔" پھر وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ نواب صاحب تھے۔ ان کی بیوی بہت چڑچڑی خاتون تھیں۔ ان کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اسے نہلاتے دھلاتے، اپنے بیٹے کے صاف ستھرے کپڑے پہناتے اور ساتھ بٹھا کر اسے ناشتا کراتے مگر وہ جانتے تھے کہ بیوی ان کے تولتے لیں گی اور اس لڑکے کو تو شاید مار مار کر اللہ کی راہ میں قربان ہی کر دیں۔ چناں چہ وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ پھر بھی جاتے جاتے انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں محبت، عقیدت، شکر گزاری اور نجانے کیا کیا تھا۔ انہوں نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکالیں پھر وہ پلٹے اور گھر کی طرف چل دیے۔

اصغر انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ میں موجود نوٹوں کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی بھوک کا احساس جاگ اٹھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک ٹھیلے پر چھولے بک رہے تھے۔ وہ اس طرف چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا آج کے دن بھی گوشت نہیں ملے گا۔

○

امداد صاحب کے ہاں قربانی ہوگئی تھی۔ ان کی بیوی نے ایک حصہ گوشت فریزر میں رکھا اور باقی گوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ندی والوں میں دے آئیں۔"

ندی کے اردگرد ایک کچی بستی تھی۔ وہاں کے باسی پیر کالونی میں ندی والے کہلاتے تھے۔ وہ بہت غریب لوگ تھے۔ مرد گھر بیٹھ کر چھوٹے موٹے کام کرتے یا خالی بیٹھتے۔ عورتیں گھروں کے کام کاج کر کے گھر چلاتیں۔ پیر کالونی میں تمام گوشت ندی والوں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔

امداد صاحب پر مولوی صاحب کے صبح کے وعظ کا گہرا اثر ہوا تھا۔ انہوں نے کہا "پڑوس میں تو گوشت بھجوا دیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ سب کے ہاں قربانی ہوتی ہے۔ بعض گھروں میں تو تین تین ہوتی ہیں۔ یہ انہیں دے کر آئیں، جن کا حق ہے۔"

"مستحق کا تو بعض اوقات پتا بھی نہیں چلتا ...." امداد صاحب نے کہا اور مولوی صاحب کے وعظ کا خلاصہ بیگم کے گوش گزار کر دیا۔

"ہٹیں ..... یہاں کوئی ایسا نہیں۔ کھاتے پیتے لوگوں کی بستی ہے۔ جیسا میں کہتی ہوں، وہی کریں۔" بیگم نے انہیں جھڑک دیا۔

امداد صاحب کو غصہ تو بہت آیا لیکن بیوی سے دبتے تھے، خاموش ہو گئے۔ اسی وقت پڑوس کا ایک بچہ آگیا "انکل، امی کہہ رہی ہیں، اپنا گوشت لے کر جائیں تو ہمارا گوشت بھی لیتے جائیں۔ ندی والوں کو دینا ہے۔"

بیگم نے امداد صاحب کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھا "دیکھا آپ نے؟" ان کے ان تین لفظوں میں بہت کچھ تھا۔

امداد صاحب نے کندھے جھکائے اور سوزوکی کی چابی اٹھالی۔

○

بچوں کو سلمی بیگم اور ریاض احمد نے الگ الگ دس دس روپے عیدی دی تھی۔ نماز سے آنے کے بعد انہوں نے بچوں کو کپڑے بدلوا دیے تھے۔ اختر نے پہلی بار پینٹ قمیض پہنی تھی۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا اور باہر نکلتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کچھ فرق جوتوں اور موزوں سے بھی پڑا تھا۔ وہ ننگے پاؤں چلنے والا جوتے پہن کر پریشان ہو رہا تھا مگر پھر اشعر کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ یقیناً" اچھا لگ رہا ہوگا۔ کیوں کہ اشعر اچھا لگ رہا ہے وہ اشعر اور فیاض کے ساتھ باہر چلا گیا۔ انہوں نے جھولا جھولا اور بوتل پی۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے اچانک اسے بھوک لگنے لگی۔

ادھر گھر میں سلمی بیگم پریشان تھیں۔ ان کی گوشت بھوننے کی سب تیاریاں مکمل تھیں مگر ساڑھے گیارہ بجے کے باوجود اب تک کہیں سے گوشت نہیں آیا۔ وہ

اس لئے اور زیادہ فکر مند تھیں کہ بچوں نے ناشتا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب گوشت ہی کھائیں گے اور ڈٹ کر کھائیں گے۔

ریاض احمد باہر سے آئے تو سلمی بیگم نے ان پر پریشانی ظاہر کی۔ "سلمی بیگم، یہ امید چھوڑ دیں۔" ریاض احمد نے افسردگی سے کہا۔ "یہاں پڑوسیوں کے ہاں گوشت بھجوانے کا رواج نہیں ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"دیکھ کر آرہا ہوں۔" ریاض احمد بولے "ابھی امداد صاحب ملے۔ وہ کئی گھروں کا قربانی کا گوشت لاد کر ندی والی بستی میں لے جا رہے تھے ..... مستحقین میں بانٹنے کے لیے۔ بتا رہے تھے کہ یہاں ایک ایک گھر میں کئی کئی قربانیاں ہوتی ہیں۔ رشتے داروں کا بھی یہی حال ہے اس لیے گوشت غریبوں اور مستحق لوگوں کو بھجوا دیا جاتا ہے۔"

"عجیب فلسفہ ہے۔" سلمی بیگم جھنجھلا گئیں۔

ریاض احمد کو حیرت ہوئی "عجیب نہیں۔ فطری بات ہے۔" وہ انہیں سمجھانے لگے "آدمی کو اپنے اسٹیٹس کے مطابق اقامت اختیار کرنی چاہیے۔ آدمی غریب ہو جائے تو اسے متمول لوگوں کے درمیان رہنے کا کوئی حق نہیں بلکہ وہ اس کے لئے مضر اور نقصان دہ ہی ثابت ہوگا۔"

"آپ کا مطلب ہے، ہمیں ان حالات میں ندی میں رہنا چاہیے۔" سلمی بیگم کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"اب جب سخت وقت گزر چکا ہے۔ صرف دو دن گزارنے ہیں ہمیں تو آپ اپنے صبر کو کیوں رائگاں کرتی ہیں سلمی بیگم۔ پرسوں انشاء اللہ ہم قربانی کریں گے۔"

"مجھے آج اور کل کی فکر ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ آج میں بچوں کو کسی طور پر بہلا نہیں سکتی اور پھر یہ زیادتی ہے کہ گلی کے ہر گھر میں قربانی ہو اور میرے بچے گوشت کو ترسیں۔" سلمی بیگم کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔" ریاض احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سلمی بیگم حقیقت پسند تھیں۔ انہوں نے پہلی فرصت میں دال چڑھالی لیکن یہ

سوچ کر وہ لرز رہی تھیں کہ بچوں کو کیسے قائل کر سکیں گی۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی آگئے۔ حسب توقع انہوں نے آتے ہی کہا، "گوشت کھلائیں امی! بہت بھوک لگی ہے۔"

"اس وقت تو میں دال پکا رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سلمی بیگم اتنی شرمندہ تھیں کہ کبھی زندگی میں نہیں ہوئی تھیں "گوشت ابھی آیا نہیں۔ آئے گا تو گوشت کھا دوں گی۔"

"میں گوشت کے سوا کچھ نہیں کھاؤں گا۔" ننھے فیاض نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"جی امی! اتنے دن سے آپ آج کے لئے کہہ رہی تھیں، اب تو میں گوشت ہی کھاؤں گا۔" یہ اشعر تھا۔

اختر نے حیرت سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کی طرح گوشت کو ترس رہے ہیں۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس افسردہ ہوگیا۔

ایک بجا ..... ڈیڑھ بج گیا۔ کہیں سے گوشت نہیں آیا۔ فیاض اب بھوک سے بلک رہا تھا، لیکن دال کھانے کو تیار نہیں تھا۔ یہی حال اشعر کا بھی تھا۔ میمونہ بھی ایک طرف سر ڈالے پڑی تھی۔ سلمی بیگم کا چہرہ یوں سپید ہو رہا تھا، جیسے کسی نے ان کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو "تم تو کھالو میمونہ بیٹی۔" انہوں نے کہا۔

میمونہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی نگاہوں کی شکایت سلمی بیگم کا دل کاٹ گئی "امی .... مجھے بھوک نہیں ہے۔" میمونہ نے آہستہ سے کہا۔

سلمی بیگم کے لئے آنسو روکنا مشکل ہوگیا۔

یہ سب دیکھنے کے بعد اختر ریاض احمد کے پاس چلا گیا "انکل، ہر گھر میں قربانی ہوئی ہے پھر آپ کے گھر گوشت کیوں نہیں آیا؟"

"بیٹے، میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔" ریاض احمد نے بے بسی سے کہا پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انکل ..... کوئی بھی کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ چھوٹا فیاض رو رہا ہے۔"

"میں کچھ بھی نہیں کر سکتا بیٹے۔"

"میں تو کر سکتا ہوں انکل۔ میں گوشت مانگ لاؤں گا۔"

"نہیں اختر۔ مانگنا کبھی نہیں۔" ریاض احمد نے سخت لہجے میں کہا "میں تمہیں سکھا رہا ہوں کہ دنیا میں ترقی وہی لوگ کرتے ہیں' جو اللہ سے مانگتے ہیں اور اپنی عقل اور زور بازو پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں بھی مدد کی پیشکش نہیں کی۔ میں نے تم سے یہی کہا ناکہ تم گھروں میں اخبار ڈالنا اور دکان میں میری مدد کرنا یعنی خود کمانا۔ پھر پڑھنا اور پیسے بچانا بھی۔ اس کے بعد دیکھنا' انشاء اللہ ایک دن تم بہت بڑے آدمی بنو گے۔ میں تمہاری مدد کروں گا تو تم خود کچھ نہیں کر سکو گے۔ چھوٹے ہی رہ جاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی انکل! میں سمجھ گیا۔"

"وعدہ کرو' کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگو گے۔ ہاں کوئی خود سے کچھ دے اور وہ بھی شدید ضرورت میں' تو الگ بات ہے۔ اس سے بھی بچنے کی کوشش کرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں انکل!"

اختر اندر چلا گیا۔ تین بج رہے تھے۔ بھوکے بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ آنٹی بھی بستر پر لیٹی تھیں۔ وہ شاید رو رہی تھیں۔ اختر بے تابانہ ٹہلتا رہا۔ انکل نے کہا تھا' اللہ سے مانگو اور اپنی عقل اور زور بازو سے کام لو۔ یہ معاملہ زور بازو کا نہیں تھا کہ وہ کسی سے گوشت چھین لاتا۔ اسے عقل سے کام لینا تھا۔

اس نے افسردگی سے سوتے ہوئے بچوں کو دیکھا۔ یہ ان لوگوں کے بچے تھے' جنہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ محبت دی تھی۔ عید کی خوشی دی تھی جب کہ وہ اپنے بچوں کے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسے ان کے لئے کچھ کرنا تھا۔

ایک دن اور ایک رات میں وہ بہت بدل گیا تھا۔ یتیم خانے میں بھی وہ تیز و طرار اور جارحیت پسند تھا مگر اب اس کے پاس خود اعتمادی بھی تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔ وہ اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔

○

ساڑھے تین بجے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ امداد صاحب نے خود جاکر

دروازہ کھولا۔ ایک خوش شکل اور خوش پوش لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔ ٹرے میں ایک برتن تھا' جس پر کپڑا پڑا تھا۔

امداد صاحب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "کہاں سے آئے ہو بیٹے؟"

"میں آپ کے برابر والے گھر سے آیا ہوں .... ریاض صاحب کے ہاں سے۔"

"تم ان کے بچے تو نہیں۔"

"جی' میں یتیم ہوں۔ کل میں بھوک سے بے ہوش ہوگیا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے آئے۔ سونے کا بستر دیا' کھانا کھلایا اور صبح نئے کپڑے دیے۔"

"ریاض صاحب بلاشبہ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"یہ میں ان کے گھر سے لایا ہوں لیکن انہیں پتا نہیں ہے۔ آپ یہ برتن انہیں واپس بھی نہیں بھیجئے گا۔ انہیں پتا نہ چلے کہ میں یہ لایا تھا۔"

امداد صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا معما ہے۔ عجیب پراسرار معاملہ تھا۔ انہیں گڑبڑ کا احساس ہونے لگا "نہیں بھئی' میں تو نہیں لیتا۔"

"دیکھئے کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کو یہ سب بتاتا ہی کیوں۔ کہتا کہ آنٹی نے بھجوایا ہے اور آپ لے لیتے۔"

لڑکے کی دلیل دل کو لگنے والی تھی "مگر بات تو پتا چلے ....."

"آپ اندر جاکر دیکھیں گے تو سب سمجھ جائیں گے۔" لڑکے نے کہا "خدا کے لیے' آپ یہ اندر لے جائیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی امداد صاحب نے ٹرے لے لی۔ وہ اندر گئے "کیا ہے؟" ان کی بیگم نے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں۔" امداد صاحب نے کہا اور قاب پر سے خوان ہٹایا۔ وہ سناٹے میں آگئے۔ زمین انہیں واضح طور پر اپنے پیروں کے نیچے سے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بیگم بڑے تجسس سے آئیں۔ قاب میں دال دیکھ کر ان کا منہ بن گیا "یہ کیا؟ کون دے کر گیا ہے۔ منہ پر ماریں اس کے۔"

"تم بقرعید کے دن کسی کے گھر سے دال آنے کا مطلب سمجھتی ہو؟ نہیں سمجھتیں۔" امداد صاحب سرد لہجے میں بولے بدبخت عورت' میں نے صبح بھی کہا تھا کہ

ؤں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اب دیکھو' سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ اور توبہ کرو۔ تمہارے گھر میں قربانی ہوئی ہے۔ تمہارا فریزر گوشت سے بھرا ہے اور گلی میں ایک گھر ایسا ہے' جہاں دال پکی ہے۔ تف ہے تم پر۔ یہ قربانی قبول ہوگی بھلا۔"

بیگم کا چہرہ فق ہوگیا "یہ کس کے ہاں سے آیا ہے؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ وہ عزت والے اور خود دار لوگ ہیں۔ یہ انہوں نے نہیں بھیجا۔ انہیں تو معلوم بھی نہیں۔ یہ مجھے ایک فرشتہ دے کر گیا ہے۔ اب یہ برتن گھر میں رکھنا یا کسی کو دے دینا اور ان کے بارے میں تجسس نہ کرنا۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں' تجسس نہ کرنا اور یہ تم جان بھی نہیں سکتیں۔ ہے نا کمال کی بات؟ اسے کہتے ہیں' سفید پوشی۔ اب تم جلدی سے ایک ڈش میں بھنا ہوا گوشت نکالو اور فریزر کے گوشت میں سے آدھا نکالو۔ آدھے سے زیادہ ہو' کم نہ ہو اور یہ سب سلیقے سے ٹرے پر رکھ دو۔" امداد صاحب کے لہجے میں ایسا تحکم تھا' جو ان کی بیگم کے لئے نیا تھا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے برا لگ رہا ہے۔" ان کی بیگم گڑگڑائیں۔ "خدا کی قسم' میں شرمندہ ہوں۔ آپ کہیں تو میں پورا گوشت دے دوں ۔ ہمارے ہاں کل بھی تو قربانی ہوگی۔"

"بس جو میں نے کہا ہے' وہ کرو۔"

Rehan Ahmed http://www.rehanahmeds.com

اختر پچھلے دروازے سے باہر گیا تھا اور ادھر ہی سے واپس آگیا۔ واپس آکر وہ چپکے چپکے سب بچوں کو جگانے لگا "اٹھ جاؤ گوشت آنے والا ہے۔ کھانا کھانا ہے۔"

تینوں بچے چونک کر اٹھ بیٹھے لیکن ان کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھنا' ابھی دروازے پر دستک ہوگی اور گوشت آئے گا۔" ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ ڈرائنگ روم میں افسردہ بیٹھے ہوئے ریاض احمد نے دروازہ کھولا۔ وہاں امداد صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے پر ایک قاب اور کافی سارا کچا گوشت تھا۔ قاب پر خوان تھا "معافی چاہتا ہوں ریاض بھائی!" امداد صاحب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "ہمارے ہاں قربانی ذرا دیر سے ہوئی۔ ہے تو ناوقت لیکن قبول فرمالیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں امداد صاحب!"

"برتن میں بعد میں لوں گا اور محلے والوں کے ہاں بھی جانا ہے گوشت لے کر۔"

ریاض احمد ٹرے لے کر اندر آئے۔ انہوں نے سلمی بیگم کو اٹھایا۔ قاب میں بھنا ہوا گوشت تھا "دیکھا سلمی بیگم ' اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہی تھیں۔ اب بچوں کو جگائیں اور کھانا لگائیں۔"

مگر پتا چلا کہ بچے پہلے ہی جاگ رہے ہیں "اختر بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے۔" فیاض چلایا "گوشت آگیا۔"

"کیا کہہ رہا تھا اختر؟" ریاض احمد نے چونک کر پوچھا۔

"ہمیں سوتے سے جگایا اور کہنے لگے ..... اٹھ جاؤ' گوشت آنے والا ہے۔"

اشعر بولا۔

ریاض احمد نے شک آمیز نظروں سے اختر کو دیکھا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"بس انکل' میرا دل کہہ رہا تھا۔" اختر نے معصومیت سے کہا۔

ریاض احمد سوچتے رہے۔ اختر تو باہر بھی نہیں گیا تھا۔ اس پر شک کا کوئی جواز نہیں تھا پھر امداد صاحب نے کہا تھا کہ انہیں اور گھروں میں گوشت لے کر جانا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ امداد صاحب مختلف آدمی ہیں۔ وہ پڑوسیوں کو گوشت بھجواتے ہیں۔

"انکل ..... تیسری رات آپ مجھے اس چورنگی پر لے کر چلیں گے نا؟" اختر نے انہیں چونکا دیا۔

وہ مسکرائے۔ دل و دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ خوش تھے۔ "ہاں بیٹے اور ہم جا کر اصغر کو بھی لے آئیں گے۔"

"آئیں بھئی سب لوگ۔ کھانا کھالیں۔" سلمی بیگم نے چہکتی آواز میں پکارا۔"

بچے ڈائننگ ٹیبل کی طرف لپکے۔ ان کی عید کی صبح ہو گئی تھی۔

○

اصغر ادھر ادھر گھومتا' کھیل تماشے دیکھتا پھرا۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ بھوکا تو نہیں تھا۔ اس نے تین پلیٹ چھولے کھا لیے تھے لیکن اس کی گوشت کی تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کے پاؤں میں کوئی چیز چبھی۔ تکلیف کا احساس ہوا تو اس نے جھک کر دیکھا اس کے تلوے میں سے خون نکل رہا تھا۔ شاید کوئی شیشہ چبھا تھا۔ اب وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

○

باجی عصر پڑھنے کے بعد دعا کر رہی تھیں— اے اللہ' مجھے صبر اور میرے چندو کو حوصلہ دے۔ یہ دعا لفظوں میں نہیں تھی' دھڑکنوں میں تھی اور ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں تھی۔

انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور سر گھما کر چندو کو دیکھا' جو مضطربانہ انداز میں

صحن میں ٹہل رہا تھا۔ قسائی کہاں رہ گیا۔ باجی نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ ذکریا صاحب نے اسے کہا ہی نہ ہو۔

اسی لمحے بھائی جان قسائی کو لے کر گھر میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

قسائی کے گھر میں قدم رکھتے ہی چندو کا بڑا شدید ردعمل سامنے آیا۔ وہ حلق سے ڈری ڈری آواز نکالتے ہوئے باجی کی طرف لپکا اور باجی کی گود میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ باجی نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اسے تھپکنے لگیں۔ "ڈرتا ہے رے چندو حوصلہ کر میرے بیٹے' میرے لال۔" انہیں احساس ہوا کہ چندو پر لرزہ طاری ہے۔ "تجھے تو پتا ہے' میں تجھے کتنا چاہتی ہوں۔" باجی کا اپنا دل بھی یوں دھڑک رہا تھا' جیسے اپنی ہی تیزی کے ہاتھوں بند ہونے والا ہو۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھیں۔ "تو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے رے چندو۔ بیٹے' میرے لال' حوصلہ کر ورنہ ماں کا کیا حال ہو گا۔ یوں تو تیری ماں مرجائے گی چندو۔" وہ اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ مگر چندو کی کوشش یہ تھی کہ ان کی آغوش میں یوں سمائے کہ کسی کو نظر نہ آئے۔

○

بھائی جان قسائی کو لے کر گلی میں داخل ہوئے تو انہیں عابد نے دیکھ لیا۔ ایک منٹ کے اندر پوری گلی کو معلوم ہو گیا کہ بھائی جان کے ہاں قربانی ہو رہی ہے۔ یہ خیال کسی کو نہیں آیا۔۔ سوائے اماں کے۔۔ کہ یہ چندو کی قربانی ہے۔ پھر بھی گلی کے لڑکے تماشا دیکھنے کیلئے جمع ہو گئے مگر جب انہیں اندازہ ہوا کہ قربانی چندو کی ہو رہی ہے تو گلی میں کھلبلی مچ گئی۔ گلی کی تمام عورتیں' بچے اور مرد آ گئے۔

باجی نے چندو پر گلاب چھڑکا۔ اس کے عطر لگایا پھر انہوں نے دیکھا کہ پوری گلی اکٹھا ہو گئی ہے۔ انہوں نے پکار کر کہا۔ "سنو۔ ۔ مجھ سے زیادہ چندو کو کوئی نہیں چاہتا اور میں ہنسی خوشی بغیر کسی لالچ کے اسے اللہ کی راہ میں قربان کر رہی ہوں تم سب کو قسم ہے' کوئی بحث نہ کرے۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ باجی اور بھائی جان سب کیلئے محترم تھے اور پھر محبت

والی بات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

حسینہ بلک بلک کر رونے لگی۔ "کیا کرتی ہیں باجی——"

"بس حسینہ——"

آنسو روکنا تو حسینہ کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے اپنی آواز کا گلا گھونٹ لیا۔

"دیکھ چندو' میری جان' میرے لال—— ماں کی محبت کی لاج رکھ لے آج۔" باجی نے چندو کے کان میں کہا۔

اور اچانک چندو یوں کھڑا ہو گیا' جیسے اس کی ٹانگوں میں جان پڑ گئی ہو۔

"چندو—— میرے بیٹے—— میرے لال—— جا' قربانی پیش کر۔" باجی کی آواز ان کی آواز نہیں لگ رہی تھی۔ "دیکھ میرے بچے' رونا نہیں۔ کوئی آواز نہ نکلے—— دم نہ مارنا میرے لال—— ہنسی خوشی——" ان کا گلا یوں رندھا کہ آواز بند ہو گئی۔

پھر چشم فلک نے—— اور تماشا دیکھنے والوں نے وہ منظر دیکھا' جو وہ قیامت تک نہیں بھول سکیں گے۔

چندو مستانہ وار' بانکپن سے چلتا مقتل کی طرف—— امرود کے درخت کی طرف چلا' جہاں بھائی جان اکڑوں بیٹھے تھے۔ چندو وہاں پہنچ کر اس طرح لیٹا کہ اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ جیسے چھری کو گلا پیش کر رہا ہو۔

دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ باجی نے اپنے منہ میں دوپٹے کا گولا بنا کر ٹھونس لیا۔

چندو نے سر گھما کر قسائی کو دیکھا' جس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلکا۔ وہ قسائی کو دیکھتا رہا۔ قسائی نے بھائی جان سے کہا۔ "چھری کون پھیرے گا جناب!"

"میں پھیروں گا۔" بھائی جان نے کہا لیکن ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

قسائی نے چھری ان کے ہاتھ میں دے دی۔ "میں اسے باندھ دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔" باجی نے بلند آواز میں کہا۔

چھری بھائی جان کے ہاتھ میں آتے ہی چندو کی آنکھوں سے خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ واضح طور پر محبت جیسا کوئی جذبہ لہریں لینے لگا۔ وہ

بیٹھے ہوئے بھائی جان کے کندھوں پر دونوں اگلے پیر رکھے اور ان کے رخسار پر پیار کیا۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اس نے بھائی جان کو اس طرح پیار کیا ورنہ پیار کا یہ انداز صرف باجی کیلئے مخصوص تھا پھر وہ دوبارہ اسی طرح لیٹ گیا۔۔ سراپا سپردگی۔۔ سر تسلیم خم کئے۔۔

بھائی جان کا چھری والا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ "ایسے کیسے کام چلے گا جناب!" قسائی نے انہیں ٹوکا۔ "مضبوطی سے چھری پکڑیں۔ تینوں نسیں کاٹنا ہوں گی ورنہ جانور کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

یہ سنتے ہی بھائی جان کے ہاتھ کو قرار آگیا' جیسے اندر سے کسی نے کہا ہو۔۔ حد ادب ناداں۔۔! انہوں نے دعا پڑی۔ منہ پھیرا۔۔ یہ سوچ کر کہ وہ دیکھ کر تو یہ سب نہیں کر سکتے لیکن فوراً ہی انہیں احساس ہو گیا کہ بغیر دیکھے وہ چندو کی مشکل آسان نہیں کر سکتے۔ اس کی اذیت بڑھا دیں گے۔

انہوں نے اس کے گلے پر نظر جمائی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے بچ رہے تھے' جو نظر کے سامنے تھیں۔ انہوں نے پھر دعا پڑھی' تکبیر۔۔۔ اور چھری پھیر دی۔

دیکھنے والے آج بھی گواہی دیں گے کہ چھری پھرنے کے بعد چندو کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز ضرور نکلی لیکن چھری پھرنے سے پہلے نہ اس نے مزاحمت کی' نہ حلق سے کوئی آواز نکالی۔۔ باجی نے یہی حکم تو دیا تھا نا۔

○

اماں آگئی تھیں۔ انہوں نے سب لوگوں کو بھیج دیا تھا۔ بھائی جان کو محلے کے کچھ لوگ لے گئے تھے۔ انہوں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

گلی اکٹھا ہ "اب کلیجی بھونو شمسہ۔" اماں نے کہا۔ "یہ تمہیں ہرحال میں کھانی ہے۔"

چاہتا اور میں ا۔۔ اولاد کا کلیجا مائیں تو نہیں کھاتیں' ڈائنیں کھاتی ہیں۔" باجی نے فریاد

سب کو قسم ہے "ر

سب کو سانز یگاں کرنے والی باتیں مت کرو۔" اماں نے سخت لہجے میں کہا۔

ں۔"

گھر میں قصوری میتھی نہیں تھی۔ باجی نے سوچا گلی میں موجود کسی بچے سے منگوا لیں گی۔ یہ سوچ کر انہوں نے دروازے سے جھانکا۔ ان کی دیوار سے لگا سات آٹھ سال کا ایک بچہ بیٹھا تھا۔ "کون ہو تم جی؟" باجی نے پوچھا۔ "پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔"

"میں اصغر ہوں۔" بچے نے روتے ہوئے کہا۔

باجی نے غور کیا تو انہیں خون نظر آیا۔ بچے کے پیر سے خون نکل رہا تھا۔

"اے ہے— یہ کیا ہوا؟"

"شیشہ لگ گیا شاید۔"

باجی باہر نکلیں۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ تلوا اچھا خاصا کٹا ہوا تھا۔ "چلو اندر' میں دھو کر دوا لگا دوں اور پٹی باندھ دوں۔" باجی نے کہا۔ اسی وقت انہیں عابد نظر آ گیا۔ "عابد' ملا جی کی دکان سے قصوری میتھی کا ایک پیکٹ تو لا دے جلدی سے۔"

وہ بچے کو اندر لے گئیں۔ انہوں نے پاؤں کی صفائی کی' جو بڑا مشکل کام تھا۔ بچے کے پیر بہت گندے ہو رہے تھے۔ "کتنے گندے رہتے ہو۔ عید کے دن بھی نہیں نہاتے؟" باجی نے دوا لگاتے ہوئے کہا۔ "کپڑے بھی میلے چیکٹ ہو رہے ہیں۔"

بچہ رونے لگا۔ باجی نے پٹی نکالی اور زخم پر لپیٹنے لگیں۔ "کہاں رہتے ہو؟"

"کہیں نہیں یتیم ہوں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔"

باجی کرید کرید کر پوچھتی رہی۔ اصغر نے انہیں پوری کتھا سنا دی۔ "بقر عید کے دن بھی تمہیں گوشت نہیں ملا؟" باجی نے اچنبھے سے کہا۔

"کچے گوشت کا میں کیا کرتا امی—"

امی سن کر باجی کا دل اس زور سے دھڑکا کہ بس پہلی بار کوئی انہیں امی کہہ رہا تھا— اور وہ بھی چندو کی قربانی کے ذرا ہی دیر بعد—

"میں کہاں پکاتا اور پکا ہوا گوشت کسی نے دیا ہی نہیں۔"

"تو فکر نہ کر۔ ہفتہ بھر میرے پاس رہ میں تجھے جی بھر کے گوشت کھلاؤں گی۔"

"مگر عید کی تیسری رات مجھے جانا ہے امی۔ میں اختر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

باجی سوچ رہی تھیں کہ اس بچے کو بیٹا بنا لیں گی لیکن دو بچے مسئلہ

"ٹھیک ہے تیسری رات چلے جانا اور ہاں، کبھی پریشانی ہو تو میرے پاس آ جانا۔ اب میں تیرے لیے کپڑوں کا بندوبست کرتی ہوں۔ عید کا دن ہے بازار بند ہو گا ورنہ تجھے کپڑے دلاتی تجھے۔"

محلے میں اصغر جیسے کئی بچے تھے۔ باجی نے ایک جوڑا لیا اور بچے کو دیا۔ "جاؤ نہا دھو کر پہن لو۔ اتنے میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

اصغر نہا کر کپڑے پہن کر واپس آیا تو باجی کلیجی بھون چکی تھیں۔ انہوں نے اسے کھلایا اور اس نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ اماں باجی کو کھانے کی تلقین کر رہی تھیں اور باجی کا یہ حال تھا کہ ہر لقمے پر رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔

بھائی جان نے بھی اماں کے اصرار پر تھوڑی سی کلیجی کھا لی لیکن ان کا بھی برا حال تھا۔

باجی نے اپنے حصے کا گوشت کسی کو نہیں دیا۔ انہوں نے اگلے تین دن میں اصغر کی گوشت سے اتنی تواضع کی کہ وہ گھبرانے لگا۔

عید کی دوسری رات باجی نے خواب دیکھا کہ ایک بہت خوب صورت شیر خوار بچہ بانہیں پھیلا کر ان کی طرف ہمک رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بول بھی رہا تھا۔ "امی—— مجھے گود میں لے لیں۔ میں آپ کا چندو ہوں۔ آپ میرا چاہے جو نام رکھ دیں، میں ہوں آپ کا چندو ہی۔ مجھے گود میں لے لیں۔"

"لیکن چندو میں نے تمہیں قربان کر دیا تھا۔"

"میں ایک بہت خوبصورت جگہ چلا گیا تھا امی! پھر کسی نے مجھ سے کہا، تم شمسہ بی کے پاس جاؤ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جاؤ، جا کر انہیں بتا دو کہ اللہ پاک ان سے بہت خوش ہیں۔ پھر میں آپ کے پاس چلا آیا۔ مجھے گود میں لے لیں امی——"

باجی خوشی سے رونے لگیں۔ انہوں نے بانہیں پھیلائیں اور بچے کو آغوش میں بھر لیا۔ "سچ ہے چندو مجھے تم سے بڑی محبت ہے لیکن اس روپ میں، میں تمہارا نام چندو نہیں، تنہیم رکھوں گی——" اس کے ساتھ ہی باجی کی آنکھ کھل گئی۔ اسی لمحے موذن نے فجر کی اذان کا آغاز کیا۔

اماں نے یہ خواب سن کر کہا۔ "مبارک ہو شمسہ' اللہ پاک نے تمہارے لیے ایک بیٹا منظور فرمایا ہے۔"

اس رات اصغر رخصت ہونے لگا تو باجی نے اسے ایک نیا جوڑا دیا' چندو کی عیدی کے پیسے دیے اور بھنے گوشت کی پوٹلی بنا کر اسے دی۔ "تم اور اختر اسے کھانا۔" انہوں نے کہا۔ "اور وہاں' کوئی پریشانی ہو تو یہاں آ جانا۔"

"شکریہ امی۔" اصغر نے کہا لیکن اس وقت وہ اختر کیلئے تڑپ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اختر کا بھی یہی حال ہے اور وہ ریاض احمد کے ساتھ اسی چورنگی پر پہنچنے والا ہے۔

○

دونوں دوست ایک ہی وقت میں بنگلے کے دروازے پر پہنچے۔ وہ سائیکلوں پر سوار تھے اور مختلف سمتوں سے آئے تھے۔ وہ بنگلا ریاض احمد کا تھا' جو انہوں نے عید کے کچھ ہی دن بعد خرید لیا تھا۔ انہوں نے وعدے کے مطابق انہیں سرونٹ کوارٹر میں رکھ لیا تھا۔

بنگلا ریاض احمد کا تھا لیکن سائیکلیں دونوں لڑکوں کی اپنی تھیں۔ وہ انہیں ریاض احمد نے خرید کر دی تھیں لیکن دونوں نے دو مہینے میں سائیکلوں کی قیمت انہیں واپس کر دی تھی۔ وہ کچھ بننے کی آرزو میں جینا سیکھ رہے تھے۔

"آج کچھ دیر ہو گئی۔" اختر نے سائیکل سے اترتے ہوئے کہا۔

"ہاں' اخبار ذرا دیر سے ملے تھے نا۔" اصغر نے کہا۔ "اب جلدی کرو۔ اسکول کو دیر نہ ہو جائے۔"

دونوں بنگلے میں داخل ہوئے اور اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگے۔ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے ریاض احمد نے انہیں پکارا۔ "اختر۔۔۔ اصغر۔" آج دکان پر ذرا جلدی آ جانا۔ نواز آج چھٹی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی آ جائیں گے۔" دونوں نے بیک آواز کہا پھر وہ کوارٹر کی طرف لپکے۔ اسکول کیلئے بھی تیار ہونا تھا۔

○

باجی یوں گھبرائی ہوئی بیٹھی تھیں جیسے عدالت میں ہوں اور ان کے متعلق فیصلہ سنایا جانے والا ہو۔ لیڈی ڈاکٹر انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ اتنی پریشان اور نروس کیوں ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے ڈاکٹر۔"

"اب آپ کو پریشانیوں اور اعصابی دباؤ سے چھٹکارا پانا ہو گا۔ بہت احتیاط کرنا ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مبارک ہو۔ آپ ماں بنیں گی۔ بس اپنا خیال رکھئے۔"

باجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اللہ — تیرا شکر ہے۔" انہوں نے زیر لب کہا۔ تصور میں چندو نے ان کے دونوں کندھوں پر اپنے اگلے پیر رکھے اور ان کے رخسار چومنے لگا۔ "مبارک ہو امی!" اس کی انسانی آواز انہوں نے واضح طور پر سنی — بچے کی آواز! شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ "شکریہ میرے بچے — میرے لال۔" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

لیڈی ڈاکٹر نے چونک کر انہیں دیکھا پھر وہ بھی مسکرا دی۔ برسوں کے بعد خوشی ملے تو ایسا ہوتا ہے۔

ختم شد